اردو املا اور اس کی اصلاح

۲۰۰۷ء

ڈاکٹر ابو محمد سحر

ڈاکٹر اخلاق اثر صاحب
کے لیے
انتہائی خلوص کے ساتھ

ابو محمد سحر
۱۸ اپریل ۲۰۰۴ء

اردو املا اور اس کی اصلاح
ڈاکٹر ابو محمد سحر

مکتبۂ ادب، ۳۹ مالویہ نگر، بھوپال-۳

ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ

۱۰/اپریل ۱۹۲۸ء -- ۲۹/اپریل ۲۰۰۲ء

پیش لفظ

نہایت خوشی اور فخر کے ساتھ مکتبۂ ادب' بھوپال' ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ کی معرکتہ الآرا تصنیف ''اردو املا اور اس کی اصلاح ''کو دوسری بار شائع کر رہا ہے۔ مکتبۂ ادب' بھوپال' نے اس کتاب کو پہلی بار ۱۹۸۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس دوران اردو کے بعض نامور اداروں نے اردو املا کے سلسلے میں ڈاکٹر سحرؔ کی سفارشات کو قبولِ عام کی سند عطا کی۔ نگار پاکستان نے اس کتاب کی اہمیت و افادیت کے پیشِ نظر اگست ۱۹۸۶ء کے شمارے کی صورت میں اس کو دوبارہ شائع کیا۔ فرمانؔ فتحپوری صاحب نے 'ملاحظات' میں ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ کی غیر جانبدارانہ سوچ' تجزیاتی روش اور مخلصانہ سعی و کاوش کو اس طرح سراہا ہے:

> '' کتاب کا نام ہے' اردو املا اور اس کی اصلاح'۔ اس کے مصنف ہیں اردو کے ممتاز و معتبر نقاد و محقق' ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ۔ ڈاکٹر سحرؔ کی پوری زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزری ہے اور ان کے نام و کام سے سارے علمی و ادبی حلقے خوب واقف ہیں۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کے سارے اہم پہلوؤں پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے اور ایسی بالغ نظری کے ساتھ لکھا ہے کہ ان کی ہر تحریر معتبر قرار پائی ہے اور قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے۔۔۔۔
>
> ان کی کتاب' اردو املا اور اس کی اصلاح' اگرچہ مختصر ہے لیکن

گزشتہ پندرہ برسوں میں اردو املا کے مسائل پر جتنی تحریریں آئی ہیں
ان سب کا احاطہ کرتی ہے اور ایسی خوش اسلوبی اور جامعیت کے
ساتھ کہ اردو املا کے اصول اور مسائل سے دل چسپی رکھنے والے
حضرات کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔"

''اردو املا اور اس کی اصلاح'' کا پہلا ایڈیشن جلد ہی ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے ایک عرصے سے اپنے مطالب اور مباحث کی اہمیت کی وجہ سے اس کتاب کے تازہ ایڈیشن کی ضرورت کو محسوس کیا جا رہا تھا۔ سحرؔ صاحب تو اس کام کو دیکھنے کے لیے اب ہمارے بیچ موجود نہیں ہیں لیکن امید ہے کہ ان کی یہ کتاب اردو املا کے وقار اور اردو دوستوں کے اعتماد کی بحالی میں متواتر اضافہ کرے گی اور اردو رسم الخط اور املا کی فکری بنیادوں اور صالح روایات کو تقویت پہنچانے کے اہم مقصد کو پورا کرے گی۔

مسز مونس سحرؔ

۲۲ر فروری ۲۰۰۴ء

بھوپال۔

اردو املا اور اس کی اصلاح

ڈاکٹر ابو محمّد سحر

(ایم اے۔ پی ایچ ڈی)

پروفیسر و صدر

شعبۂ اردو

گورنمنٹ حمیدیہ کالج، بھوپال

اردو املا اور اس کی اصلاح : پہلی اشاعت ۱۹۸۲ء، دوسری اشاعت ۲۰۰۴ء

مصنف : ڈاکٹر ابو محمد سحر

تعداد : ۵۰۰

مطبع : بھارت پرنٹنگ پریس، بھوپال
۲۴۴، زون ۔ ۱، ایم. پی نگر، بھوپال ۔ ۱۱

ناشر : مکتبۂ ادب ۳۹، مالویہ نگر، بھوپال ۔ ۳

قیمت : ۱۰۰/- روپے

ملنے کا پتا:

مکتبۂ ادب ۳۹، مالویہ نگر، بھوپال ۔ ۴۶۲۰۰۳

فون نمبر: ۵۲۲۰۵۱۰ ـ ۲۵۵۱۹۰۶ (۰۷۵۵)

Urdu Imla Aur Uski Islah by Dr. Abu Mohammad Sahar

First Published in 1982, This Second Edition, 2004. Price : Rs 100/-

MAKTABA-E-ADAB,

39, Malviya Nagar , BHOPAL 462003.

Ph No. (0755) 2551906 & 5220510

اردو

کے

نوجوان

ادیبوں

شاعروں

استادوں

اور

طالب علموں

کے

نام

فہرست

☆ دیباچہ	۷
☆ اردو املا کی اصلاح	۹
☆ اردو املا	۲۸
☆ املا کی غلطیاں	۳۷
☆ الف اور ہائے مختفی	۴۵
☆ ہائے ملفوظ متصل	۵۳
☆ اضافت	۵۷
☆ امالہ	۶۸
☆ الفاظ کو الگ اور ملا کر لکھنا	۷۹
☆ چند متفرق باتیں	۸۵
☆ رموز اوقاف اور علامات	۹۶
☆ خاتمہ	۹۹

دیباچہ

اردو املا کی اصلاح کا مسئلہ بڑا پیچیدہ اور اختلافی ہے۔ جہاں زیادہ تر لوگ قدیم روایات اور اپنی روش پر قائم رہنا چاہتے ہیں وہیں کچھ لوگ بڑھ چڑھ کر ترمیم و اصلاح کا علم بلند کرتے ہیں۔ دونوں رویّوں میں کسی نقطۂ اتصال کی تلاش بہت مشکل ہے۔ اردو املا کی اصلاح کسی منضبط نظام کی تابع نہیں رہی ہے۔ اکثر تبدیلیاں انفرادی کوششوں کی بدولت ہوئی ہیں یا پھر انھیں کے زیر اثر کسی ادارے نے اصلاحات کو رائج کرنے کی سعی کی ہے۔ اس سے وقت کے ساتھ املا کے قابلِ قبول روپ ابھرے ہیں لیکن نظم و ضبط پیدا نہیں ہو سکا۔ تجربہ شاہد ہے کہ جب بھی کسی فرد یا ادارے نے چلن اور بعض دوسرے نکات کو نظر انداز کر کے املا کی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی ہے، انضباد و اعتماد کے بجائے انتشار و مایوسی کا دور دورہ ہوا ہے۔ گزشتہ پندرہ سولہ سال سے اردو املا اسی صورتِ حال سے دوچار ہے۔

املا کی اصلاح جیسے اختلافی موضوع پر قلم اٹھانا ایک علمی خطرہ مول لینے سے کم نہیں لیکن جناب رشید حسن خاں کی کتاب ''اردو املا'' اور املا نامہ مرتبہً ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی اشاعت کے بعد اس موضوع پر از سر نو غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کی ضرورت تھی۔ یہ مختصر کتاب اس ضرورت کو پورا تو نہیں کر سکتی لیکن

اسی کے پیش نظر لکھی گئی ہے۔

علمی اور ادبی حیثیت سے کسی زبان کی بقا اور ترقی کے لیے املا' ترتیب متن اور تدوین لغت کی بڑی اہمیت ہے اردو کے حال اور مستقبل کا انحصار بھی اس پر ہے کہ وہ عام طور پر کس طرح لکھی جاتی ہے اور اس کے بنیادی متن' املا کا' اور لغات' املا اور زبان دونوں کا' کیا معیار پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو کا کوئی نیا جامع لغت ابھی شائع نہیں ہوا ہے لیکن املا اور ترتیب متن کے عجیب و غریب نمونے دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ میں نے کئی ایسے اصولوں اور اصلاحوں کی حقیقت واضح کردی ہے جن پر تحقیق اور منطق کا نظر فریب رنگ چڑھا ہوا ہے اور کچھ قابلِ غور تجویزیں بھی پیش کی ہیں۔ میرا منشا صرف یہ ہے کہ ان مسائل سے خاطر خواہ دل چسپی پیدا ہو اور آئندہ اردو کے حق میں بہتر نتائج برآمد ہوں۔

یہ کتاب پریس میں جا چکی تھی اور میں اس سلسلے کی ایک اور کتاب تقریباً مکمل کر چکا تھا کہ جناب حفیظ الرحمان واصف کی کتاب ''ادبی بھول بھلیاں'' میری نظر سے گزری جس میں رشید حسن خاں صاحب کی تصانیف ''زبان اور قواعد'' اور'' اردو املا'' پر تنقید کی گئی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب مجھے پہلے نہ مل سکی اور اس دیباچے میں اتنی گنجائش نہیں کہ اس سے زیادہ کچھ عرض کرسکوں۔ دوسری کتاب میں اس کی تلافی کروں گا۔

بھوپال۔

۲۹ رمئی ۱۹۸۲ء

ابو محمد سحر

اردو املا کی اصلاح

بیسویں صدی سے پہلے اردو املا کی اصلاح اور معیار بندی کی ایسی کوششیں تو نہیں ملتیں جیسی صحت زبان اور تصحیح لغت کے سلسلے میں ملتی ہیں لیکن املا کے عملی نمونوں میں وقت کے ساتھ جو فرق نظر آتا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اس طرف بھی اہلِ علم برابر متوجہ رہے ہیں۔ کہیں کہیں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے ان کی طرزِ فکر اور کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ امیر مینائی نے امیر اللغات میں جدید زبان کی طرح جدید املا کو اپنانے کی بڑی کوشش کی تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''۳ جزو ۴ ورق کاپیوں کے آئے اور مقابلہ ہو کر آئے۔ اس پر بے مبالغہ کئی سو غلطیاں ہیں۔ اور یہ نقصان املا کا کہ ''آنکھ'' کو ''آنکہ'' اور ''ساتھ'' کو ''ساتہ'' اور ''کچھ'' کو ''کچہ'' وغیرہ وغیرہ ہزاروں جگہ لکھا ہے۔ اس کا تدارک تو ہو نہیں سکتا۔ ہائے مخلوط کا دو چشمی لکھنا کیسا، یائے مجہول و معروف کے لکھنے میں بھی کہیں کہیں نقصان ہے۔ 'ے' کو کہیں نصف ''یے'' سے لکھا ہے اور کہیں معکوس ہے اور 'ے' کو کہیں

معکوس لکھا ہے اور کہیں یوں لکھا ہے: سمیٰ۔ الغرض
املا کے اعتبار سے امیر اللغات مطلق قابلِ التفات
نہیں۔ ملامت نامۂ جنگی لکھ بھیجا ہے مگر کیا ہوتا ہے
............کئی دن سے جلیل اور حسین کا پیاں صحیح کر
رہے ہیں اور ابھی کئی دن یہی کام ہوگا' پھر خوشنویس
ضحاک کو بلوا کر مطبع کی سیاہی سے کا پیاں بنواؤں
گا ورنہ مجھے یقین نہیں کہ وہاں سب مقام بنائے
جائیں گے[۱]

انیسویں صدی کے اواخر میں املا کا ایک معیار اہلِ نظر کے سامنے تھا' یہ اور بات ہے کہ مختلف وجوہ سے جو اردو طباعت میں کسی نہ کسی شکل میں آج بھی دخیل ہیں' اس پر پوری طرح عمل درآمد ممکن نہ تھا۔

اردو املا کی اصلاح کی باقاعدہ اور ہمہ گیر کوشش غالبًا پہلی بار مئی ۱۹۰۵ء کے فصیح الملک کے ذریعے سے منظرِ عام پر آئی جس میں مولانا احسن مارہروی نے کئی تجویزیں پیش کیں۔ ان تجویزوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) دیکھیے' دیجیے' لیے وغیرہ میں' یے ' سے پہلے ہمزہ نہ لکھا جائے۔

(۲) ہندی الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی کے بجائے الف ہو۔ جیسے پتا' بھروسا' دھوکا' مہینا' ٹھیکا۔

---

[۱] امیر مینائی از شاہ ممتاز علی آہ' ۱۹۴۱ء' خط مورخہ یکم دسمبر ۱۸۹۰ء بنام آہ' ص ۳۰۳' ۳۰۴

(۳) حلوا، معما، تمغا، چلیپا، ناشتا وغیرہ میں ہائے مختفی نہ لکھی جائے۔

(۴) جب لفظ کے آخر میں ہائے مختفی آئے تو فاعلیت' مفعولیت اور اضافت کی حالت میں اسے 'یے ' سے لکھا جائے جیسے کسی زمانے میں۔ اسی طرح حالت ترکیبی یعنی عطف واضافت میں بھی عربی و فارسی الفاظ اسی طرح لکھے جائیں جس طرح بولے جاتے ہیں مثلاً لب و لہجے میں' مقدمے بازی میں وغیرہ۔

(۵) نون بالاظہار پر نقطہ اور نون غنہ بغیر نقطے کے لکھا جائے۔ نون غنہ لفظ کے درمیان میں ہو تو اس پر الٹا جزم (٘) لگایا جائے۔

(۶) ہائے مخلوط کو ہائے دوچشمی سے جیسے بھی، بھان اور ہائے ملفوظ کو شوشے سے لکھا جائے جیسے کہیں، جگہ، ہو۔

(۷) جو الفاظ الگ الگ لکھنے میں اجنبی نہیں معلوم ہوتے اور جن کی ترکیب بھی جداگانہ ہے اکثر جدا جدا لکھے جائیں مثلاً آئیں گے، ہوں گے' غرض کہ' بل کہ' کیوں کہ' علاحدہ' حالاں کہ' چناں چہ' دل چسپ' ہم سر' کم یاب' دست یاب' خوب صورت وغیرہ۔[1]

---

[1] یہ خلاصہ اردو املا از رشید حسن خاں، ص ۳۲ اور ۳۳ سے کیا گیا ہے۔ اردو املا میں اقتباسات علمی نقوش از ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ صفحات کا حوالہ نہیں دیا گیا۔

بیسویں صدی کے ربع اوّل میں اردو کے جو لغات شائع ہوئے ان میں الفاظ و محاورات کو املا کی صحت کے ساتھ درج کرنے کی کوشش کی گئی۔ نور اللغات میں اس کا خاص طور سے اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن اندر کی عبارت کا املا ان لغات میں بھی بڑی حد تک وہی ملتا ہے جو اس زمانے کی کتابوں میں عام ہے۔

املا کی اصلاح کی طرف لوگوں کی زیادہ توجہ اس وقت ہوئی جب اردو کے لیے رومن رسم خط یا دیوناگری رسمِ خط اور ٹائپ اختیار کرنے کی تجویزوں نے زور پکڑا۔ لفظوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے لکھنے، حروف کی تعداد کو کم کرنے اور ان کی لکھائی میں تبدیلی کرنے کا خیال زیادہ تر ٹائپ اختیار کرنے کی تجویز کی وجہ سے ہوا اور وہ بھی اس مفروضے پر کہ ٹائپ کی چھپائی کے لیے مروّجہ املا موزوں نہ تھا۔ ادھر رسمِ خط کی تبدیلی کا سوال بڑا سنگین تھا۔ اردو املا میں اپنے آپ تبدیلیاں ہو رہی تھیں، پھر بھی بڑی بے قاعدگی تھی اور اس کا بھی تقاضا تھا کہ اصلاح کے لیے قدم اٹھایا جائے۔

اب جو بحث و تمحیص شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ رسمِ خط کی تبدیلی ناممکن ہے۔ زیادہ تر لوگ اصلاح کے بھی قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک چلن کو دیکھتے ہوئے املا کی تھوڑی بہت اصلاح کی جا سکتی تھی۔ لیکن کچھ حضرات وسیع پیمانے پر اصلاح چاہتے تھے۔ مرزا جافر حسن کی ''آسان رسمِ خط'' (۱۹۴۰ء) جس میں کئی حروفِ تہجی کو خارج کر دیا گیا تھا اس کی مثال ہے۔ اس زمانے میں رسمِ خط اور املا میں خلطِ مبحث اسی وجہ سے پایا جاتا ہے کہ اصلاح کی تجویزیں

رسمِ خط اور املا دونوں کی اصلاح کو محیط تھیں۔ اس پس منظر میں انجمن ترقئ اردو (ہند) نے ۱۹۴۳ء میں ایک اصلاحِ رسمِ خط کمیٹی مقرر کی۔ سیّد ہاشمی فرید آبادی کی ابتدائی تجاویز پر غور کرنے کے لیے اس کمیٹی کی میٹنگ ۲۲ر مارچ ۱۹۴۳ء کو دہلی میں انجمن کے دفتر میں ہوئی، جس میں مولوی عبدالحق، سیّد ہاشمی فرید آبادی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، برج موہن دتا تریہ کیفی اور وہاج الدین کنتوری نے شرکت کی۔ کمیٹی کی تجاویز جن کے مرتب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی تھے ۱۶ر ستمبر ۱۹۴۳ء کے ''ہماری زبان'' میں شائع کی گئیں۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۴۴ء کو کل ہند اردو کانفرنس ناگپور' کی رسمِ خط کی مجلس نے ترمیم واضافہ کر کے ان کو منظور کیا اور تجاویز جنوری ۱۹۴۴ء کے ''اردو'' میں شائع ہوئیں۔

ان اصلاحات میں مولانا احسن مارہروی کی تجاویز پر مبنی اصلاحات کے ساتھ کئی ایسی اصلاحات تھیں جن کو دیکھ کر آج تعجب ہوتا ہے لیکن ان کی تہ میں اس زمانے کے خیالات کے مطابق ٹائپ کے لیے آسانیاں فراہم کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا مثلاً اس قسم کی اصلاحات کہ لکھنا کو لکھ نا' لکھتے کو لکھ تے' پھانس کو پھاں س' بین کو بی ن' بَین کو بَی ن' پیر کو پی ر' پَیر کو پَی ر' جائے کو جاء ے' دائرہ کو داء رہ' کوئی کو کوء ی' زائل کو زاء ل' طائر کو طاء ر' مصیبت کو مصی بت' گھر کنا کو گھ رک نا' قرینہ کو قری نہ' دھرتی کو دھ رتی' ادھورا کو ادھ ورا لکھا جائے۔ اس کے علاوہ بالکل کو بلکل' خوش کو خش لکھنے اور ث' س' ص میں سے ص کو اور ذ' ز' ض اور ظ

میں سے ذ اور ض کو خارج کرنے کی سفارش کی گئی تھی ا۔

پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے اپنے ایک مضمون میں ان اصلاحات کے بارے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اس سے کئی پہلوؤں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن انھوں نے اصلاحات کی ناکامی کے کچھ اسباب کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

''اصلاحات کے سلسلے میں دراصل مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی خدمات ہمیشہ احترام کی نظروں سے دیکھی جائیں گی۔ ان حضرات نے انشا کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے کہ اردو میں کوئی لفظ خواہ عربی کا ہو یا فارسی کا یا ترکی کا جس طرح اردو میں رائج ہو گیا ہے خواہ اصل کی رو سے صحیح ہے یا غلط اسے اردو کا لفظ سمجھنا چاہیے' املا کے لیے بہت مناسب اصلاحات تجویز کی تھیں۔ ان اصلاحات کی خوبی یہ تھی کہ ان میں چلن' استعمال' آواز اور تلفظ کو مدنظر رکھتے ہوئے آج کی تدریسی اور طباعتی ضروریات کے لیے گنجائش نکالی گئی تھی۔ ان سفارشات پر کچھ لوگوں نے عمل کیا اور ایک زمانے میں رسالہ' اردو' اور انجمن کی مطبوعات میں بھی ان کا لحاظ رکھا گیا۔ مگر آئے دن کی ضروریات' کاتبوں

ا انجمن کی کمیٹی اور اس کی اصلاحات کے متعلق تفصیلات املا نامہ مرتبہ' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ص ۱۷ اور ۲۵ سے اخذ کی گئی ہیں۔ جناب رشید حسن خاں نے کچھ مثالیں دے کر لکھا ہے کہ ''ڈاکٹر صدیقی مرحوم آخر تک اپنی تحریروں میں اسی طرح لکھتے رہے (آ ی' جا' وو غیرہ) انجمن کی بعض مطبوعات میں بھی جگہ جگہ اس کی مثالیں نظر آتی ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے یہ طریقہ رائج نہیں ہو سکا اگرچہ نہایت مناسب تھا۔'' اردو املا' ص ۳۵۲

کی عادت اور سرمائے کی کمی کی وجہ سے ان پر پورا عمل نہ ہو سکا۔''[۱]

ناکامی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ اکثر اصلاحات کو قبول عام کی سند حاصل نہ ہو سکی۔ اصلاحات کی نوعیت اور ان پر عمل درآمد کے طریقے کی وجہ سے لوگوں کو اصلاحِ رسم خط کمیٹی کی نمائندہ حیثیت پر بھی شک ہوا اور انجمن ترقیٔ اردو (ہند) کی کارگزاری ایک اختلافی مسئلہ بن گئی۔ کوئی تین سال کے اندر اکتوبر ۱۹۴۶ء میں ناگپور ہی میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اس کے شعبۂ اردو کے خطبۂ صدارت میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ نے رسمِ خط کی اصلاح کے سلسلے میں ایک اور تجویز پیش کی۔ ان کے الفاظ تھے:

> '' اردو رسمِ خط میں ضرورتِ زمانہ کے مطابق اصلاحیں ہوتی رہی ہیں اور اب بھی ہو سکتی ہیں۔ اس کام کے لیے ماہرین کی ایک نمائندہ کل ہند کمیٹی بنانا چاہیے جو مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر کر کے ادیبوں، ناشروں معلموں سے مشورہ کرنے کے بعد اردو رسمِ خط کے قاعدے معیّن کر دے۔ یہ قاعدے کثیر تعداد میں چھاپ کر اردو کتابوں کے چھاپنے اور شائع کرنے والوں' اردو کے رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹروں' اردو میں مقالے اور کتابیں لکھنے والوں اور سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی اداروں کے پاس بھیج دیے جائیں اور سررشتۂ تعلیم کی منظوری کے بعد درسی کتابوں میں ان کی پابندی لازمی کر دی جائے۔''[۲]

---

[۱] اردو رسم الخط علمی و تہذیبی نقطۂ نظر سے مشمولہ اردو میں لسانیاتی تحقیق مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، ۱۹۷۱ء، ص ۴۲۶

[۲] اردو زبان اور اس کا رسمِ خط از سید مسعود حسن رضوی ادیب، جولائی ۱۹۴۸ء ص ۶۵

سیاسی حیثیت سے اردو اس سارے زمانے میں جس کشمکش کا شکار رہی اس کی تفصیل میں جانا تحصیل حاصل ہے۔ ملک کی تقسیم نے ہندوستان میں اس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ ہندوستان کی سرکاری زبان کا مسئلہ جب زیرِ بحث آیا تو اردو کے لیے بھی آواز اٹھائی گئی لیکن صحیح معنوں میں وہ میدان ہی میں نہ تھی۔ وہ پاکستان کی سرکاری زبان بن چکی تھی ۔ اب اگر کوئی جھگڑا تھا تو وہ ہندی اور انگریزی، اور اردو کو چھوڑ کر دوسری علاقائی زبانوں کے درمیان تھا۔ فیصلہ ہندی کے حق میں ہونا ہی تھا۔ پھر بھی اردو کا مقدمہ پیش کیا گیا۔ اس سلسلے کی ایک علمی کوشش ''ہندوستان کی قومی زبان اور رسم الخط'' از معین الدین دَردائی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جو ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی۔ ہندی کے سرکاری زبان قرار دیے جانے کے بعد رسمِ خط کی تبدیلی کا مسئلہ اب اردو کے سامنے اس لیے تو نہ تھا کہ اسے سرکاری زبان کا درجہ مل سکتا تھا لیکن ہندی کے غلبے کی وجہ سے بہت جلد کچھ لوگ اس کی بقا کے لیے بھی اسے ضروری سمجھنے لگے۔

جہاں تک ابتدائی کتابوں کا تعلق ہے، ۱۹۲۰ء میں مولوی احمد علی، ناظر تعلیمات دکن، کی تجویز پر ہندی کی ماتراؤں کی تقلید میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے نئی علامتیں اختیار کر لیں تھیں ۔ ۱۹۲۶ء میں یہی کام عبدالغفار مدھولی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شروع کیا۔[۱] ان کوششوں کی وجہ سے اردو کے غیر

---

[۱] اردو رسمِ خط میں علامتیں از عبدالغفار مدھولی، مشمولہ اردوئے معلی مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، جلد سوم، شمارہ ۴-۵، ص ۲۸۶، ۲۸۹

اعرابی رسمِ خط کو اعرابی حدود میں داخل کرنے کے رجحان نے کم سے کم ابتدائی درسی کتب میں پہلے ہی ایک حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ۱۹۵۸ء کے آس پاس غلام رسول نے چار نئے اعراب واوِ لین، یائے لین، رائے ممدودہ اور نیمہ، اور ایک اعرابی مشق یعنی اردو بارہ کھڑی اختراع و دریافت کیے۔[۱] اردو کی ابتدائی درسی تعلیم میں اب بالعموم ایسے ہی قائدے داخل ہوئے۔ بالفاظ دیگر ہندی کی ماتراؤں کے طرز پر اعراب و علامات کے اضافے کے ساتھ اب اردو بالکل ہندی کی طرح پڑھائی جانے لگی۔ ابتدائی سطح پر اردو کی ''دشواریوں'' کا حل گویا یہ نکالا گیا کہ اردو کو ہندی بنا دیا جائے۔ کسی نے یہ نہیں سوچا کہ اگر ابتدائی سطح پر اردو ہندی کی طرح پڑھائی جائے گی تو ثانوی سطح پر بھی وہ اس سے بچ نہیں سکتی، بلکہ اس طریقے سے اردو سیکھنے والا ہر سطح پر اعراب و علامات کی کمی محسوس کرتا رہے گا، اور اس منطق کو بھی تقویت ملے گی کہ اردو کو ہندی بنانا ہے تو پھر ہندی ہی پر کیوں نہ اکتفا کی جائے۔ اردو کے نئے قاعدوں کو رائج کرنے والے یہی دعوا کرتے ہیں کہ ان سے اردو پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سابقہ تناسب کے مقابلے میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی رہی ہے اور جو بچے ان قاعدوں سے پڑھتے ہیں ان کو بعد میں اعراب و علامات کے بغیر اردو پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے کہ ہندی کے طرز پر اردو میں اعراب کے اضافے سے بچوں کو اردو

---

[۱] اردو املا از غلام رسول، ۱۹۶۰ء، ص ۸

پڑھنے میں انگریزی سے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسمِ خط کی اصلاح اور ٹائپ اختیار کرنے کے لیے زمین تیار کرنا انجمن ترقئی اردو (ہند) کی حکمت عملی کا ایک اہم جزو تھا۔ اگرچہ حالات بہت بدل چکے تھے لیکن انجمن نے ۱۹۵۶ء میں پھر رسمِ خط کی اصلاح کے لیے ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی۔ سوالنامہ اس انداز سے ترتیب دیا گیا کہ رسمِ خط میں اصلاح اور ٹائپ اختیار کرنے کے بارے میں لوگوں کی رائے معلوم کی جائے۔ انجمن کی ۱۹۴۴ء کی اصلاحات سے متعلق سوالات کے ساتھ ایک سوال اسی ہندی رسمِ خط کی پیدا کی ہوئی الجھن سے متعلق تھا:

> ''کیا ہندی حروفِ علّت کی طرح اردو حروفِ علّت کی صوتی نقطۂ نظر سے ماترائی اور مکمل شکلیں قائم کرنے کی ضرورت ہے؟[۱]''

بقول پروفیسر آل احمد سرورؔ صاحب:

> '' اس سوالنامے کے جواب میں اسّی جواب موصول ہوئے۔ اسّی میں سے اگرچہ پینسٹھ نے سفارش کی تھی کہ چھپائی کے لیے نسخ اور لکھاوٹ کے لیے نستعلیق استعمال ہو مگر انجمن کی جولائی

۱۔ بحوالہ اردو رسم الخط اور اس کی اہمیت از محمد امین عباسی، ۱۹۵۹ء، ص ۲۰

۱۹۵۷ء کی کانفرنس میں اس کی اتنی مخالفت ہوئی کہ معاملہ آگے
نہ بڑھ سکا۔"

اس کے باوجود پروفیسر آل احمد سرور نے جو انجمن کے سکریٹری تھے اپنی رائے نہیں بدلی:

"بہر حال میری رائے میں اس معاملے میں پس و پیش نہ کرنا
چاہیے اور تمام متعلقہ حضرات کو اس پر آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ
رفتہ رفتہ چھپائی کا سب کام ٹائپ میں کریں۔"

اسی مضمون میں انھوں نے نہ صرف انجمن کی پچھلی اصلاحات کی تائید و تعریف کی ہے بلکہ اس سے بھی کچھ آگے بڑھ کر اظہارِ رائے فرمایا ہے:

"بل کل، فورن، ادنا، اعلا تو اب لوگ لکھنے لگے ہیں۔ میں تو
عبدالحفیظ کو بھی عبدل حفیظ اور فضل الرحمن کو فضل رحمان لکھنے
کے حق میں ہوں۔ عبدل دہلوی کا ابراہیم نامہ ابھی مسعود حسین
خاں کی ترتیب سے شائع ہوا ہے۔ یہ کیا ستم ظریفی ہے کہ
ہے کہ عبدل علاحدہ تو اردو کے قاعدے سے لکھا جائے مگر
عبدالحفیظ عربی قاعدے سے لکھنا ضروری ہو۔"[1]

اردو کے مخالفوں کی طرف سے اردو رسمِ خط اور زبان کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو اعتراضات ہوئے اور ہوتے ہیں ان سے بہت سے اردو داں

---

[1] اردو رسم الخط عملی و تہذیبی نقطۂ نظر سے از پروفیسر آل احمد سرور، مشمولہ اردو میں لسانیاتی تحقیق، ص ۴۲۹

اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے اور ہیں کہ اگر اردو رسمِ خط اور زبان کی اصلاح سے اعتراضات کے پہلو دور ہو جائیں تو اردو کو ہمارے ملک میں جائز مقام مل جائے گا اور وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے گی۔ اس کی وجہ سے اردو دنیا ایک زمانے سے کھلبلی کا شکار ہے اور یہ کھلبلی روز بروز بڑھتی رہی ہے۔ آج اردو کے بعض اہلِ علم اپنی زبان میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جو خامیاں نکالتے ہیں انکی خبر شاید اردو کے مخالفوں کو بھی نہیں ہے۔ اردو کے رسمِ خط' املا' خزانۂ الفاظ' اس کے حروفِ تہجی کے ناموں اور ان کی وجہ سے الفاظ کے ہجے' حروفِ تہجی کے صوری انداز ترتیب یہاں تک کہ خود اس کے نام کی نامعقولیت بعض اردو دانوں سے پوچھیے۔ ہر چیز جو داہنی طرف سے شروع ہوتی ہے سیدھی مانی جاتی ہے لیکن اردو کے داہنی طرف سے لکھے جانے کی جب بات ہوتی ہے تو سیدھا الٹا ہو جاتا ہے۔ کسی زبان کو اس کا جائز مقام دینے کے لیے شائد ہی کبھی یہ شرط لگائی گئی ہو کہ پہلے وہ اپنی تمام حقیقی اور فرضی خامیوں کو دور کرے' اس کے بعد ہی اسے زندہ رہنے کا موقع دیا جائے گا۔ لیکن اردو کے لیے اس کے مخالفوں اور حامیوں دونوں کی طرف سے یہی شرط ہے، حالانکہ اتنا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کوئی رسمِ خط اور زبان ایسی نہیں ہے جس میں خامیاں نہ ہوں یا جس کے سیکھنے میں دقتیں نہ ہوں، انگریزی اور ہندی بھی اس سے مستثنا نہیں ہیں۔

اردو میں چھپائی کے لیے ٹائپ کے استعمال میں اصولاً کوئی برائی نہ تھی۔ ہندوستان میں اردو کی کچھ کتابیں ٹائپ میں چھپی بھی ہیں عربی اور

فارسی میں کلّی طور پر اور پاکستان میں اردو کی چھپائی میں جزوی طور پر آج کل جو ٹائپ استعمال ہو رہا ہے وہ پہلے سے کافی بہتر اور دیدہ زیب ہے اور ہندوستان میں بھی اردو کے لیے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اردو پر سب سے سنگین اعتراض یہی ہے کہ وہ بدیسی رسمِ خط میں لکھی جاتی ہے۔ اگرچہ اس کا بارہا جواب دیا جا چکا ہے، یہاں تک کہ اردو زبان کی طرح رسمِ خط کو بھی ہندوستانی سمجھنے اور ماننے کے لیے معقول توجیہات کی جا چکی ہیں لیکن اس سے معترضین کی تشفی نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں چھپائی کے لیے عام طور پر ٹائپ یعنی خط نسخ اختیار کر کے اردو ہندوستان میں ایک بہت بڑے خطرے سے دو چار ہو سکتی ہے۔ عربی تو خطِ نسخ میں چھپتی ہی تھی۔ یہ ایک نیک فال ہے کہ ایران میں چھپائی کے لیے کلّیتاً خطِ نسخ اختیار کر لیا گیا ہے۔ اردو نستعلیق کی چھپائی کو برقرار رکھ کر ہندوستان میں اپنی انفرادیت کو مستحکم بنا سکتی ہے۔ ۱۹۵۷ء کی اردو کانفرنس میں ٹائپ کی مخالفت خواہ کسی بنیاد پر کی گئی ہو وہ اس کا ثبوت تھی کہ اردو اپنی قیمتی روایت کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہتی، چاہے وہ اس کے جاننے والوں کی اکثریت کی مذہبی زبان یعنی عربی کے رسمِ خط ہی کا معاملہ کیوں نہ ہو۔

رسمِ خط اور املا کی اصلاح کے مقاصد جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن اتنا ماننا پڑیگا کہ آزادی کے بعد انجمن ترقئ اردو (ہند) نے اس معاملے میں انتہا پسندی سے کام نہیں لیا اور جو اصلاحیں نا مقبول ہو چکی تھیں ان کو چلانے کی ضد نہیں کی۔ چنانچہ اس زمانے میں انجمن کی کتابوں، رسالے اور اخبار کا املا مروّجہ املا سے

زیادہ مختلف نہیں رہا۔ اردو املا میں ترمیم اور تنسیخ کرنے کا بیڑا دراصل ایک اور ادارے نے اٹھایا۔ ۱۹۶۵ء میں مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی نے حکومتِ جموں وکشمیر کی مالی امداد سے معیاری ادب کے تحت کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تو املا میں اصلاح کی طرف خاص رجحان دیکھنے میں آیا۔ جناب رشید حسن خاں کی ترتیب دی ہوئی کتابوں کے دیباچوں، متن اور فرہنگوں میں بڑی دور رس اصلاحات کردی گئیں۔ کئی دوسری کتابوں میں مرتبین کے دیباچے تو زیادہ تر مروجہ املا میں چھاپے گئے لیکن متن کی طباعت اسی انداز سے کی گئی جو رشید حسن خاں کی مرتب کی ہوئی کتابوں کا تھا۔ بظاہر یہ کام انھیں کے زیر اثر ہوا۔ مرکبات کو الگ الگ لکھنا، متعدد الفاظ کے مروّجہ املا میں ردّ و بدل، ہندی یا اردو الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی کے بجائے الف لانا، الفاظ کے آخر کی ہائے ملفوظ متصل میں شوشہ لگانا، اضافت کی صورت میں یائے مجہول و معروف پر ہمزہ نہ لانا اور رموزِ اوقاف واعراب کی افراط ان کتابوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

۱۹۶۹ء میں حکومتِ ہند نے اردو میں علمی ضروریات کی کتابوں کی اشاعت کو بڑھاوا دینے کے لیے ترقیٔ اردو بورڈ قائم کر کے اردو کی بقا اور فروغ کے لیے ایک بے مثال قدم اٹھایا۔ چونکہ بورڈ کا تمام تر کام تصنیف و تالیف سے متعلق ہے اس لیے کچھ بنیادی مسائل کا سامنے آنا لازمی تھا۔ یہ بات بڑی اطمینان بخش ہے کہ بورڈ نے ٹائپ میں کتابیں چھاپنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ تاہم اربابِ حل وعقد کی توجہ ایک بار پھر اردو املا کی اصلاح کی طرف منعطف ہوئی۔

۱۹۷۳ء میں ایک املا کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے صدر ڈاکٹر سیّد عابد حسین مرحوم اور رکن جناب رشید حسن خاں اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تھے۔ جناب رشید حسن خاں نے ایک ضخیم کتاب ''اردو املا'' کا مسودہ املا کمیٹی کے سامنے پیش کیا جسے کمیٹی نے منظور کر لیا۔ مئی ۱۹۷۴ء میں بورڈ نے ''املا نامہ'' کے نام سے املا کمیٹی کی سفارشات شائع کیں جس کے مرتب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں۔ اسی کے ساتھ رشید حسن خاں کی کتاب ''اردو املا'' بھی ترقی اردو بورڈ کی طرف سے شائع ہوئی۔ انھوں نے ایک مختصر کتاب ''اردو کیسے لکھیں' بھی مرتب کی جسے مکتبۂ جامعہ نئی دہلی نے اگست ۱۹۷۵ء میں شائع کیا۔

''املا نامہ'' بڑی حد تک رشید حسن خاں کی کتاب ''اردو املا'' کا خاکہ ہے۔ اس کے مقدمے میں بھی لکھا گیا ہے کہ

> ''ذیل کی سفارشات محض خاکا ہیں بنیادی اصولوں کا۔
> تفصیل اور جامع فہرستوں کے لیے رشید حسن خاں کی
> کتاب سے رجوع کرنا چاہیے[۱]''

لیکن کئی موقعوں پر دونوں میں اختلاف بھی ہے مثلاً:

(۱) املا نامہ میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے زور دینے کے مطابق ''زرا'' ہے اور اردو املا میں ''ذرا''۔

(۲) املا نامہ اور اردو املا دونوں میں ''یہ'' ہے لیکن املا نامہ میں یہ

---

[۱] املا نامہ ' مقدمہ' ص ۲۶

نوٹ بھی دیا گیا ہے کہ

''یہ میں و کی آواز بہت کمزور ادا ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کو ہ کے شوشے کے

بغیر لکھنا بھی صحیح ہے۔''[1]

(۳) املا نامہ کے مطابق بلکہ' کیونکہ' جبکہ' چنانچہ' چونکہ کو دو ٹکڑوں میں لکھنا مرجح ہے لیکن ملا کر لکھنا بھی صحیح ہے۔ اردو املا میں دو ٹکڑوں ہی میں صحیح ہے۔

(۴) املا نامہ میں ہائے مختفی پر ختم ہونے والے شہروں کے ناموں کو اسی طرح لکھنے کی سفارش کی گئی ہے جس طرح وہ رائج ہیں مثلاً آگرہ' کلکتہ۔ اردو املا میں ہے کہ ان ناموں کو ''فی الحال'' یوں ہی برقرار رکھا جائے لیکن غیر معروف یا کم معروف ناموں کو یا مستقبل میں جن ناموں کا اضافہ ہو' ان سب کو الف ہی سے لکھا جائے۔ جیسے بھٹورا' سردھنا۔

(۵) املا نامہ میں آزمائش' نمائش' آئندہ' نمائندہ وغیرہ کو ہمزہ اور یے دونوں سے صحیح مانا گیا ہے۔ اردو املا میں ایسے الفاظ کو صرف یے سے صحیح بتایا گیا ہے۔

(۶) املا نامہ میں اعداد کے ذیل میں ہے کہ ''اٹھارھواں کے بجائے اٹھارواں لکھنا فصیح ہے''۔ اردو املا میں اس کی صورت صرف

---

[1] املا نامہ ص ۵۹

''اٹھارواں قائم کی گئی ہے۔

(۷) املا نامہ میں اعراب وعلامات کے ذیل میں سنسکرت تلفظ کے لیے معکوسی نون (ڻ) کی علامت دی گئی ہے۔ اردو املا میں اسے غیر ضروری قرار دیا گیا ہے۔

(۸) اردو املا کا مقدمہ لسانیاتی انداز میں لکھا گیا ہے اور بعض الفاظ کے املا کی توجیہہ میں بھی لسانیات کی چند اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ اردو املا میں زیادہ تر سیدھا سادہ طریقہ اپنایا گیا ہے۔

''اردو کیسے لکھیں'' اس استثنا کے ساتھ ''اردو املا'' کا خلاصہ ہے کہ چند عنوانات آگے پیچھے کر دیے گئے ہیں اور موٴخر الذکر کے تین آخری ابواب املا سے فارسی' تدوین اور املا' لغت اور املا کو حذف کر دیا گیا ہے۔ موضوع اور ضخامت کو دیکھتے ہوئے یہ تینوں ابواب ''اردو املا'' میں زائد معلوم ہوتے ہیں۔

املا نامہ کے پیش لفظ میں ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم نے لکھا ہے:

> ''ترقی اردو بورڈ تو اپنی تمام مطبوعات میں ان سفارشات پر عمل کرے گا ہی' اردو کے دوسرے اداروں' انجمنوں' ادیبوں' شاعروں' اخباروں کے ایڈیٹروں اور پبلیشروں سے بھی امید کی جاتی ہے کہ وہ ان سفارشات کو اپنائیں گے اور اردو املا کو ایک معیار پر لانے میں مدد کریں گے۔''[1]

---

[1] املا نامہ ' پیش لفظ 'ص ۶

اس سے ظاہر ہے کہ ترقی اردو بورڈ نے ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اردو کے دوسرے اداروں، انجمنوں، عالموں، ادیبوں اور شاعروں کی رائے معلوم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ اسے الٹی یہ امید ہے کہ تمام لوگ ان سفارشات کو قبول کرلیں گے۔ جناب رشید حسن خاں نے اردو املا کے بارے میں لکھا ہے کہ ''املا کے موضوع پر یہ اردو میں پہلی مفصّل کتاب ہے۔''[۱] حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب اصلاحِ املا کے موضوع پر ہے اور اس انداز سے لکھی گئی ہے کہ کسی کو دم مارنے کا موقع نہ ملے۔ ''اردو کیسے لکھیں'' میں سرورق ہی پر کتاب کے نام کے نیچے قوسین میں ''صحیح املا'' لکھا ہوا ہے۔ اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ صحیح املا یہی ہے اور اس میں ردّ و قبول سے کام لینے کا کوئی پہلو نہیں ہوسکتا۔ مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی نے حکومتِ جموں و کشمیر کی امداد سے بہت سی کتابیں اور ترقیٔ اردو بورڈ نے بعض کتابیں اسی ترمیم شدہ املا کے مطابق شائع کردی ہیں۔ تعجب ہے کہ اردو املا اور املا نامہ میں مکتبۂ جامعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا، حالانکہ کئی اصلاحیں وہی ہیں جن کے مطابق مکتبۂ جامعہ کوئی دس برس پہلے سے کتابیں شائع کررہا تھا۔ املا نامہ کی اشاعت کے بعد کچھ حضرات نے کئی بنیادی ترمیموں سے اختلاف کیا تھا لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلے پر اس سے کہیں زیادہ توجہ کی ضرورت ہے جتنی اس وقت تک دی گئی ہے، تاکہ ایک طرف اردو دانوں کو

---

[۱] اردو کیسے لکھیں، پیش لفظ، ص ۸

معلوم ہوکہ یہ ڈاکٹر جافر ہسن، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور انجمن ترقیٔ اردو کی وہ اصلاحات نہیں ہیں جن پر یا تو بالکل عمل نہیں کیا گیا یا پوری طرح عمل نہیں کیا گیا، اور دوسری طرف ترقی اردو بورڈ اور دوسرے اداروں کو احساس ہو کہ ان وسیع اصلاحات کو قبول عام حاصل نہ ہوا تو کس قدر نقصان ہوگا۔

اردو املا

اردو املا کے تدریجی ارتقا کا کوئی ایسا مفصل تحقیقی مطالعہ اب تک پیش نہیں کیا گیا جس سے مختلف ادوار میں اس کے انداز اور تغیر و تبدل کی پوری اور صحیح کیفیت سامنے آتی۔ کچھ متفرق مثالیں ملتی ہیں۔ سرسری معلومات اور مشاہدات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ابتدا میں جب کتابیں قلمی نسخوں تک محدود تھیں حروف کی کشش، شوشوں اور نقطوں وغیرہ کے اعتبار سے لکھاوٹ کا طریقہ بہت مختلف تھا۔ شائد کوئی مقررہ طریقہ ہی نہ تھا اور لوگ جس طرح چاہتے تھے لکھ دیتے تھے۔ اردو کی ابتدائی مطبوعات میں اس طرز املا کی سنبھلی ہوئی شکل ملتی ہے۔ بعد کی مطبوعات میں کچھ تبدیلیاں رونما ہوئیں اور رفتہ رفتہ املا کا ایک روپ دکھائی دینے لگا جیسا کہ نول کشور پریس اور اس زمانے کے دوسرے مطبعوں کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط اور آخر یا بیسویں صدی کی ابتدا کی مطبوعات دیکھیے تو املا میں کافی فرق نظر آئے گا۔ یہ فرق ایک خاموش تغیر کا نتیجہ تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں کچھ افراد کی کوششوں سے قطع نظر کر کے املا کی اصلاح کی باضابطہ کوشش انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام ہوئی۔ مفرد الفاظ کو الگ الگ لکھنے ' کہنی دار 'ے' اور دو چشمی 'ھ' میں امتیاز

برتنے، بعض الفاظ کو ہمزہ کے بجائے 'یے' اور ہائے مختفی اور 'ی' کے بجائے الف سے لکھنے اور رموزِ اوقاف کا چلن انجمن کی کتابوں کے زیر اثر ہوا۔ جس حد تک ان امور کو قبول کیا گیا اسے بھی خاموش تغیر ہی کہا جائے گا۔ اس سے انتشار اور بے قاعدگی کچھ کم ہوئی لیکن دور نہ ہو سکی بلکہ بعض اصلاحوں پر کسی کے عمل کرنے اور کسی کے نہ کرنے سے اکثر املا کی ایک نئی شکل کا اضافہ ہو گیا۔

املا میں انتشار اور بے قاعدگی کوئی اچھی چیز نہیں کہی جا سکتی لیکن اردو میں اس کے جو اسباب ہیں ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود کچھ عجب اتفاق ہے کہ اردو املا کے گرمجوش مصلحین ہمدردی اور حقیقت پسندی سے کام لینے کے بجائے بڑی بیدردی اور مثالیت پسندی کا رویّہ اختیار کرتے ہیں۔ املا میں چن چن کر خامیاں نکالتے ہیں، بلکہ مروجہ املا سے بعض فرضی خامیاں منسوب کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ ایک حسّاس اردو داں کو اس پر شرم آنے لگتی ہے کہ وہ ایک ایسی زبان سے تعلق رکھتا ہے جس کو اس کے عالم، استاذ، ادیب اور شاعر صحیح لکھنے سے قاصر ہیں۔ جناب رشید حسن خاں کی محنت و جانفشانی سر آنکھوں پر لیکن وہ بھی اردو املا سے بہت برگشتہ ہیں۔ وہ املا کی صرف سیّال حالت کو دیکھتے ہیں اور اس معیار پر اکتفا نہیں کرتے جو متعین ہو چکا ہے یا کم سے کم مروج ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''انتشار کی حکومت یہاں تک پھیل گئی ہے کہ ہم آج بھی
> کبھی 'مجھ کو' لکھتے ہیں اور کبھی 'مجکو'۔ کبھی اسکو علاحدہ علاحدہ
> (مجھ کو) لکھتے ہیں اور کبھی ملا کر (مجھکو)۔ 'لیے' کو بھی کبھی ی

سے لکھتے ہیں کبھی ہمزہ سے اور کبھی دونوں کو جمع کر دیتے ہیں
(لیے' لئے' لیئے)۔'پتا' کو کبھی الف سے لکھتے ہیں اور کبھی
ہائے مختفی کے ساتھ (پتا' پتہ)۔'پانو' میں کبھی واو سے پہلے
نون غنہ لکھتے ہیں کبھی واو پر ہمزہ لگا کر اس کے آخر میں
نون غنہ لکھتے ہیں' کبھی 'پانا' کے فعل کی طرح درمیانی نون
غنہ کے بغیر لکھتے ہیں (پانو' پانوں' پاؤں)۔'گزرنا' کو کبھی
ذال سے لکھتے ہیں' کبھی زے سے (گذرنا' گزرنا)[1]''۔

دوسرے موقعوں پر انھوں نے اُس کے ساتھ اوس' اُدھر' کے ساتھ اودھر' کچھ کے ساتھ کچھہ' مجھ کے ساتھ مجبہ' ہاتھ کے ساتھ ہاتھہ' بیٹھ کے ساتھ بیٹھہ' مہ کے ساتھ مہہ اور یہ کے ساتھ یہہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

جن الفاظ کا بیان اوپر آیا ہے ان میں سے ہر ایک کی شکل مروّجہ املا میں متعین ہو چکی ہے مثلاً مجھ کو' لیے' پتا' پاؤں' گزرنا' کچھ' مجھ' ہاتھ' بیٹھ' مہ اور یہ وغیرہ۔ جناب رشید حسن خاں ان میں سے تین الفاظ (پاؤں' مہ' یہ) کے املا کو صحیح نہیں مانتے۔ اسی طرح اور بہت سے الفاظ کا مروّجہ املا ان کے نزدیک غلط ہے وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ ایسے الفاظ کے املا میں ترمیم اور زیادہ انتشار کا باعث ہوگی۔ ان الفاظ کے ساتھ املا کی متروک مثالوں اور معمولی غلطیوں کو پیش نظر رکھنے کی وجہ سے انھیں غلطیاں ہی غلطیاں دکھائی دیتی ہیں اور وہ بہت سی اصلاحات کر

---

[1] اردو املا' ص ۲۰' ۲۱

ڈالتے ہیں۔ ان کا لب ولہجہ بڑا آمرانہ ہو جاتا ہے اور اصلاحات کے فوری نفاذ کی فکر بھی دامن گیر ہوتی ہے۔ انھیں اس کا احساس ہوتا ہے کہ ''زبان کے معاملے میں انقلابی تجاویز عموماً ساتھ نہیں دے پاتیں اور یہ بات کچھ ہندوستان ہی سے یا اردو ہی سے مخصوص نہیں'' پھر بھی ان کے قلم سے یہ الفاظ نکل جاتے ہیں:

''ہاں کہیں کوئی ایسی مطلق العنان حکومت ہو جو زبان کو اس کے سارے متعلقات کے ساتھ ''نیشنلائز'' کر ڈالے اور حکومت کی مشینری اس انقلاب کو بروئے کار لے آئے؛ یہ دوسری بات ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ہندوستان میں فی الوقت یہ صورت نہیں ہے اور بظاہر یہ مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل قریب میں بھی یہاں اس انداز کی 'صاحبی' یا 'نادر شاہی' پیدا ہو سکے: تو پھر اس املائی انقلاب کو کون لائے گا؟''[1]

اردو املا کی اصلاح اور اس کے نفاذ کے سلسلے میں اس قسم کے خیالات کا اظہار خواہ مشروط طور پر ہی کیوں نہ کیا گیا ہو کسی طرح مناسب نہیں۔ ایک تو مطلق العنانی زندگی کے کسی میدان میں مستحسن نہیں قرار دی جا سکتی چہ جائیکہ املا کے میدان میں' دوسرے' ملک میں کسی مطلق العنان حکومت کے قیام کا تصور بڑا تشویشناک ہے۔ لیکن جناب رشید حسن خاں واقعی بڑی عجلت میں ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی اصلاح ممنوع تو قرار دی ہی نہیں جا سکتی' تھوڑی دیر کے لیے ملتوی بھی نہیں کی جا سکتی۔

---

[1] اردو املا' ص ۴۹

عیسیٰ اور لیلیٰ وغیرہ کو الف سے لکھنے کی ہدایت کرنے کے ساتھ انھیں کچھ ترکیبوں کا خیال آتا ہے لیکن لکھتے ہیں:

"عیسیِ مریم اور لیلیِ شب جیسے مرکبات نظم میں استعمال کیے گئے ہیں مگر ان کی اس خاص صورت کی بنا پر ان کا الف سے لکھا جانا نہ ممنوع قرار پائے گا نہ ملتوی ہوگا۔"[1]

جناب رشید حسن خاں نے اپنے کام کی بنیاد انجمن ترقی اردو (ہند) کی اصلاح رسمِ خط کمیٹی کی تجاویز (۱۹۴۴ء) کو بنایا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تحریروں اور مکاتیب پر بہت زیادہ انحصار کیا ہے اور کہیں کہیں اپنے خیالات کو آخری شکل دینے میں احمد بہمنیار کے مقالے 'املای فارسی' مشمولۂ لغت نامۂ دہخدا سے اثر قبول کیا ہے۔ یہ تینوں ماخذ بڑی حد تک ایک ہی سمت لے جاتے ہیں۔

انجمن کی اصلاح رسمِ خط کمیٹی کی تجاویز ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے مرتب کی تھیں۔ وہ مختلف زبانوں میں الفاظ کی اصل، ان کی ساخت اور تغیر و تبدل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اردو املا کی اصلاح کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے اپنایا اور اس میں عربی، فارسی اور ہندی کی بحثوں اور تحقیقِ لغت کو شدّت کے ساتھ داخل کیا۔ وہ اردو املا میں یکرنگی اور یکسانی کے خواہاں

---

[1] اردو املا، ص ۱۰۸

تھے اور اسے ضروری سمجھتے تھے کہ املا کے قاعدے منضبط ہوں اور ان کی بنیاد ''صحیح اصول'' پر ہو۔ ان کی غیر معمولی علمیت' نیک نیتی اور لگن پر ایمان نہ لانا کفر ہے لیکن جیسا کہ تحقیقی نقطۂ نظر اور صحیح اصول کی جستجو میں ہوتا ہے اکثر ان کا طرزِ استدلال اردو املا کی روایت کے خلاف پڑتا تھا اور ان کی بعض تجویزیں نا قابل عمل معلوم ہوتی تھیں۔

رسمِ خط میں تو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی اصلاحات بالکل نہیں چلیں لیکن املا کی اصلاح میں بھی ان کے سوچنے کا ایک مخصوص ڈھنگ تھا جس کی پابندی نہ تو آسان تھی اور نہ ہر شخص کے لیے قابلِ قبول ہوسکتی تھی مثلاً ذات کے بارے میں انھوں نے اپنے مخصوص تحقیقی شعور سے یہ بات نکالی' اور اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے' کہ ذات بمعنی نفس یا شخص عربی لفظ ہے' سنسکرت لفظ جات یعنی نژاد یا قوم کے معنی میں ''ذات'' لکھنا درست نہیں۔ اس معنی میں ''زات'' لکھنا چاہیے۔ اس طرح انھوں نے ''ذرا'' (بمعنی تھوڑا) کو غلط اور ''زرا'' کو صحیح قرار دیا۔ لفظ کی تحقیق کی حد تک یہ بات بڑے معرکے کی ہے اور زبان کا بڑے سے بڑا ماہر اس سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے لیکن ایسی تحقیق سے الفاظ کے مسلّمہ املا میں ترمیم لازمی نہیں ہوسکتی۔ ایک تو اس طرح ہم کہاں کہاں مسلّمہ املا کو بدلتے رہیں گے اور سوچتے رہیں گے کہ کہاں ذال سے لکھیں اور کہاں زے سے' جبکہ اصلاح کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ ایسی دشواریاں کم ہوں' دوسرے زے سے لکھنے کی منطق بھی زیادہ دور تک ساتھ نہیں دے سکتی کیونکہ زے بھی بہر حال عربی حرف ہے۔ اگر اصل کا

لحاظ رکھنا ہوتو پھر ''جات'' اور ''جرا'' لکھنا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں لفظ کی تحقیق درست ہے لیکن املا میں ترمیم کی تجویز ٹھیک نہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ جناب رشید حسن خاں نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تقلید میں رسمِ خط کی اصلاح کے میدان میں قدم نہیں رکھا (حالانکہ ایک جگہ برسبیلِ تذکرہ بعض اصلاحات کو نہایت مناسب قرار دیا ہے) اورذات اور ذرا کے متعلق بھی ان کی رائے پر عمل نہیں کیا لیکن کہیں کہیں وہ اس اندازِ فکر سے کام لے کر ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر صدیقی نے لکھا ہے:

''اردو میں 'گذر' اور 'گذار' اور مشتقات کو زیادہ تر 'ز' ہی سے لکھتے ہیں اور یہ کچھ بے جا نہیں 'مگر 'ذ' بھی ان لفظوں میں صحیح اور جائز ہے''۔[۱]

لیکن رشید حسن خاں صاحب نے گذشتن، گذاشتن، گذاردن اور گزاردن میں امتیاز کر کے گزشتہ، گذارش، رہ گزر وغیرہ کو غلط قرار دیا ہے۔ یہاں ڈاکٹر صدیقی کی رائے ماننے کے بجائے انھوں نے احمد بہمنیار کی تقلید کی ہے اور لغت نامہ دہخدا سے ان کے مقالے ''املای فارسی'' کا اقتباس پیش کیا ہے۔[۲]

انجمن ترقی اردو کی اصلاح املا کی تحریک کا جہاں اس زمانے میں خیر مقدم کیا گیا تھا وہیں اس کے خلاف ردِّ عمل بھی ہوا تھا۔ سیّد مسعود حسن رضوی ادیب کے خطبے ''اردو زبان اور اس کا رسم خط'' میں اس کے بالواسطہ اثرات موجود

۱۔ اردو املا از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مشمولہ اردو میں لسانیاتی تحقیق، ص ۶۵ ۲۔ اردو املا، ص ۱۵۴

ہیں۔اس سلسلے کی کچھ اور کتابیں اور مضامین بھی ہیں۔انجمن ترقی اردو نے ۱۹۵۶ء میں جو سوالنامہ جاری کیا تھا اس کے جواب میں محمد امین عباسی نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھ ڈالی تھی جو ۱۹۵۹ء میں ''اردو رسم الخط اور اس کی اہمیت'' کے نام سے نیاز فتح پوری کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔مصنف کا نقطۂ نظر بہت انتہا پسندانہ ہے جس سے مجھے اتفاق نہیں لیکن اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسم خط یا املا کی اصلاح کا معاملہ کتنا نازک ہے اور اس میں زیادہ چھیڑ چھاڑ کرنے سے کیسے کیسے ردعمل ہو سکتے ہیں۔انجمن ترقی اردو کی اصلاح رسم خط کمیٹی کی سفارشات کوئی تیس سال پہلے کی تھیں۔ان میں سے زیادہ تر مقبول نہیں ہو سکیں۔ان پر اس پہلو سے غور کرنا چاہیے تھا۔جناب رشید حسن خاں اگر کچھ ایسے مآخذ اور پہلو پیش نظر رکھتے جو انجمن کی اصلاح املا کی تحریک کے سراسر خلاف ہیں یا اس سے میل نہیں کھاتے تو ان کے نقطۂ نظر میں توازن بھی پیدہ ہوتا اور اعتدال بھی۔

ان امور سے قطع نظر کر کے یہ سمجھنا بھی آسان نہیں کہ رشید حسن خاں نے املا کی اصلاح کا کوئی اصول سامنے رکھا ہے یا محض اصلاح برائے اصلاح پر عمل کیا ہے۔کہیں وہ لفظ کی اصل کی وجہ سے مروّجہ املا میں ترمیم کرتے ہیں، کہیں لفظ کی اصل اور مروّجہ املا میں مطابقت کے باوجود اصلاح ضروری سمجھتے ہیں اور کہیں مروّجہ تلفظ کے بارے میں کسی غلط فہمی پر اصلاح کی بنیاد رکھتے ہیں۔''ہندوستان'' کے بارے میں انھیں تسلیم ہے کہ اس لفظ میں اصلاً واوَ ہے۔لیکن ان کے نزدیک

''بول چال میں عموماً واؤ کے بغیر آتا ہے'' پھر ہندستانی اکیڈیمی اوراس کے رسالے ہندستانی کا ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ اسے بغیر واؤ کے لکھنا چاہیے۔[1] ہندوستان کو کچھ لوگ ہندستان بولتے اور لکھتے ہوں گے اور اسے غلط نہیں کہا جا سکتا لیکن اردو میں اس کا مروّج اور فصیح تلفظ ہندوستان ہی ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے باشندے کے معنی میں ''ہندوستانی'' مروّج اور فصیح ہے۔ البتہ زبان کے نام کے طور پر ''ہندستانی'' استعمال ہوتا ہے۔ ہندستانی اکیڈیمی اور رسالہ ہندستانی اسی لحاظ سے بغیر واؤ کے ہیں۔ ہندوستان کے باشندے کے معنی سے انھیں کچھ علاقہ نہیں۔ مذاق سلیم کو جو فیصلہ ہندوستان اور ہندوستانی کے حق میں کرنا چاہیے تھا وہ ہندستان اور ہندستانی کے حق میں ہوا۔ اردو نظم ونثر ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ ڈالیے آپ کو زیادہ تر ہندوستان اور ہندوستانی ہی ملیں گے۔ معلوم نہیں املا کی اصلاح کا یہ کون سا تصور ہے جس کے مطابق ہم کو ایسے صحیح، مروج اور پیارے الفاظ سے ہاتھ دھونا ہے۔

اردو املا کی اصلاح کے ناقابلِ قبول نمونوں اور تجویزوں پر اگر تفصیل سے گفتگو کی جائے تو اچھا خاصا طومار ہو جائے۔ آئندہ صفحات میں اختصار کے ساتھ کچھ اہم اصولوں اور اصلاحوں کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

---

[1] اردو املا، ص ۲۶۴

املا کی غلطیاں

املا کی ایسی غلطیاں جو عام طور پر لکھنے والوں کی لاعلمی، غلط فہمی یا بے احتیاطی وغیرہ کی وجہ سے ہوتی ہیں ان کا تدارک ہونا چاہیے۔ لیکن صحیح معنوں میں ان کا تعلق اصلاحِ املا سے نہیں ہے۔ اسی طرح الفاظ کی صحت یا عدم صحت بھی املا سے غیر متعلق ہے۔ غلط لفظ کا املا صحیح اور صحیح لفظ کا املا غلط ہوسکتا ہے۔ جہاں لفظ کی تحقیق میں اختلاف ہے وہاں املا میں بھی اختلاف ہوگا۔ مصالح اور مسالا دو لفظ ہیں۔ ہم یہ تو کہ سکتے ہیں کہ مصالح کا لفظ غلط ہے اور مسالا کا لفظ صحیح ہے لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ مصالح کا صحیح املا مسالا ہے۔ چاول اور چانول اور گھاس اور گھانس کی مثالیں زیادہ صاف ہیں۔ چاول اور گھاس کو چانول اور گھانس پر بحیثیت الفاظ ترجیح دی جاسکتی ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوسکتا کہ چانول کا صحیح املا چاول اور گھانس کا صحیح املا گھاس ہے پرانے لغات اور دیگر مآخذ کا حوالہ دینے سے شاید یہ خیال ہو کہ یہ الفاظ اب متروک ہیں لیکن جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی ایک نظم ''گرمی اور دیہاتی بازار'' میں دونوں کو استعمال کیا ہے۔ گھانس، دھانس کے قافیے کے طور پر آیا

ہے لیکن اس کی بنا پر اس لفظ کی صحت پر شبہہ نہیں کیا جا سکتا۔ ملاحظہ ہو:

مکھیوں کی بھنبھناہٹ، گڑ کی بو، مرچوں کی دھانس
خربزے، آلو، کھلی ، گیہوں ، کدو، تربوز، گھانس
دھوپ کی شدت، ہوا کی یورشیں، گرمی کی رَو
کملیوں پر سرخ چانول، ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جو [1]

جناب رشید حسن خاں ''انھیں'' کے بجائے ''انھی'' لکھتے ہیں مجھے اس لفظ کی صحت کے بارے میں شبہہ رہا ہے۔ فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات دونوں اس لفظ سے خالی ہیں۔ شاید یہ لفظ یا ''ان ہی'' کتابت کی غلطی کی وجہ سے کہیں کہیں پائے جاتے ہیں یعنی ''انھیں'' کو ''انھی'' یا ''ان ہی'' لکھ دیا گیا ہے۔ جناب رشید حسن خاں نے اس لفظ کو ترجیحی صورتوں میں شمار کیا ہے۔[2] اس سے زیادہ تعجب مجھے اس بات پر ہوا کہ ''اردو املا'' میں سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی تحریروں کے اقتباسات اور نور اللغات کے حوالے سے رشکؔ لکھنوی کے ایک شعر میں ''انھی'' لکھا ہوا ہے۔[3] میں نے سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کے سلسلے میں اصل ماخذ اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے سلسلے میں ایک اور ماخذ دیکھا۔ دونوں میں ''انھیں'' ملا۔[4] رشکؔ کے شعر میں بھی نور اللغات میں

[1] شعلہ و شبنم از جوشؔ ملیح آبادی، جون ۱۹۴۳، ص ۱۵۷ [2] اردو املا، ص ۳۰۲

[3] دیکھیے اردو املا، ص ۴۲۸،۸۲،۵۳۵ [4] دیکھیے اردو زبان اور اس کا رسم خط ص ۵۶ اور اردو میں لسانیاتی تحقیق، ص ۵۵

''انھیں'' درج ہے:

اے رشکِ انھیں کا بلبل بستان مدح ہوں
جو بار ہوں ہیں گلشن خیر البشر کے پھول[۱]

متن میں اس قسم کی تحریف بڑی افسوسناک ہے کیونکہ یہ املا کی اصلاح نہیں بلکہ لفظ اور زبان کی اصلاح ہے اور اس سے پڑھنے والے کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہ لفظ معتبر لکھنے والوں نے استعمال کیا ہے۔

پرواہ اور پروا کے سلسلے میں رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''اصل لفظ ''پروا'' ہے مگر متقدمین اس لفظ کو بہ اضافۂ 'ہ' پرواہ بھی استعمال کرتے تھے.........اب یہ لفظ ہ کے بغیر مستعمل ہے اور اسی طرح لکھا جائے گا: پروا۔''[۲]

یہ بھی املا کی نہیں، زبان کی اصلاح ہے۔ جہاں ''پرواہ'' آئے گا وہاں پرواہ ہی لکھا جائے گا نہ کہ پروا۔ جناب رشید حسن خان نے اپنی ایک اور کتاب ''زبان اور قواعد'' میں ایسے بہت سے الفاظ اور پیرایوں کو دوبارہ استعمال کرنے کی سفارش کی ہے جو ایک زمانے سے متروک ہیں۔ معلوم نہیں وہ ''پرواہ'' کے کیوں خلاف ہیں۔ خود میری رائے ''پرواہ'' کے حق میں نہیں ہے لیکن یہ بحث جداگانہ ہے کیونکہ اس کا تعلق زبان کی معیار بندی سے ہے۔ صحت زبان اور صحت املا کو خلط ملط نہ کرنا چاہیے۔ املا کی غلطی کا سوال صرف وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں لفظ صحیح طور پر نہ لکھا گیا

---

[۱] نور اللغات، جلد اول ۱۹۲۴ء، ص ۴۷۶ [۲] اردو املا، ص ۲۹۴، ۲۹۵

ہو۔ بصورت دیگر لفظ کو غلط یا متروک قرار دیا جائے گا نہ کہ املا کو۔ اس سلسلے میں ذہن صاف ہونا چاہیے۔ لیکن جناب رشید حسن خاں کو املا کی بحث میں نہ صرف تصحیح لغت بلکہ توسیع لغت کا بھی خیال رہتا ہے۔ وہ ایک لفظ "گرمالش" کو جسے انھوں نے ریڈیو پر اونی کپڑوں کے اشتہار میں سنا تھا، قبولیت کا خلعت دلانا چاہتے ہیں ۔[1]

اردو میں اختلافِ املا کا ایک اور سبب یہ ہے کہ لکھنے میں بعض حروف مثلاً ذال اور زے، ہمزہ اور یے اور الف اور ہائے مختفی کا ادلا بدلا ہوتا رہا ہے اور بہت سے الفاظ میں اسے غلطی میں شمار نہیں کیا گیا۔ گذشتہ اور گزشتہ، آرایش اور آرائش اور تماشا اور تماشہ کی صورت اس سے مختلف ہے کہ زندگی کو ذندگی، طاقت کو تاقت اور انتظار کو انتصار لکھ دیا جائے۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ رہ گذر لکھنا چاہیے لیکن کوئی رہ گزر لکھتا ہے تو اسے غلط نہیں کہہ سکتے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی رائے اس کتاب کے دوسرے باب میں پیش کی جا چکی ہے۔ علامہ کیفی لکھتے ہیں:

> "گزشتن اور پزیرفتن سے جتنے صیغے ہیں انھیں زائے معجمہ ہی سے لکھنا صحیح ہے۔ ذال سے ٹھیک نہیں۔"[2]

---

[1] دیکھیے اردو املا، ص ۴۳۱۔ اردو کیسے لکھیں ص ۸۲ میں اس لفظ کو اردو کے مستعمل لفظوں میں درج کر دیا ہے۔ [2] کیفیہ از برج موہن دتاتریہ کیفی ۱۹۴۲، ص ۳۵۲

گذاشتن اور گزاردن کے صیغوں میں ذال اور زے کا فرق کر کے کام چلا لیا جائے گا لیکن فارسی کے جن مصدروں کے ایک سے زیادہ مختلف معنی ہیں مثلاً پرداختن (خالی کرنا، مشغول ہونا، سنوارنا) اور خواندن ——— (پڑھنا، بلانا) وہاں فارسی میں کیا کیا جاتا ہے۔ سیاق و سباق کے سوا معنی سمجھنے کی صورت نہیں ہو سکتی۔ فارسی یا عربی الفاظ کے اس قسم کے جھگڑوں کو چھیڑ کر اردو دانوں کو تذبذب میں ڈالنا اب بے وقت کی راگنی ہے۔ گذاشتن، گزاردن اور پذیرفتن کے صیغوں کے الفاظ کے لیے اگر صرف زے کو اختیار کر لیا جائے تو یہ ہر اعتبار سے بہتر ہوگا۔ اردو میں معنی بدلنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ بے شمار الفاظ ہیں جن کا املا ایک ہے لیکن معنی ایک سے زیادہ ہیں۔ یہاں ذال کو برقرار رکھنے سے املا کی گڑبڑ سے نجات نہیں مل سکتی۔

اردو کے لیے گذاشتن اور گزاردن وغیرہ میں امتیاز غیر ضروری ہے۔ زے کا چلن کافی ہو چکا ہے مثلاً گزارش، گزشتہ، سرگزشت، رہ گزر وغیرہ بکثرت لکھا جاتا ہے۔ اردو کا مصدر گزرنا ہے اور اس سے بننے والے تمام الفاظ اور محاورے زے ہی سے لکھے جاتے ہیں۔

اردو میں مختلف زبانوں کے الفاظ ہیں۔ ان میں سے بعض اپنی اصلی حالت میں ہیں اور بعض بدل گئے ہیں۔ ایک طرف ان کی اصل ہے اور دوسری طرف ان کی بدلی ہوئی شکل۔ کبھی لوگ ان کی اصل کی طرف جاتے ہیں اور کبھی بدلی ہوئی شکل کو دیکھتے ہیں۔ اگرچہ اردو کے اپنے مزاج اور انفرادیت کی بات

صدیوں سے کی جارہی ہے لیکن اس چکر سے اردو کبھی پوری طرح نکل نہیں سکی۔ انشا کے مشہور قول کا بار بار ذکر کرنے کے باوجود آج بھی کسی لفظ یا اس کے املا کی صحت زیرِ بحث آتی ہے تو عربی اور فارسی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ بعض الفاظ فرہنگ نویسوں کے نزدیک بھی مختلف فیہ تھے لیکن ان کی کوئی ایک شکل صحیح مان لی گئی یا مروج ہوگئی اب اردو میں جو لفظ یا ترکیب جس شکل میں آگئی اور مروج ہوگئی یا ایک مدت سے مروج ہے وہی شکل صحیح مانی جائے گی۔ ایک لفظ ہے ''بوالہوس'' فارسی کے فرہنگ نویسوں میں اس کی صحت کے متعلق اختلاف تھا لیکن اردو میں یہ لفظ اسی طرح آگیا۔ ہمارے فرہنگ نویسوں نے اس کے بارے میں فیصلہ بھی کر دیا مثلاً:

> ''بوالہوس۔ع۔ بو مخفف ابو کا ہے۔ بعض فرہنگ نویسوں کی رائے ہے کہ ہوس فارسی ہے' اس پر الف لام تعریف کا لانا صحیح نہیں ہے۔ اور یہ لفظ بُل (بہت) اور ہوس (آرزو) سے مرکب ہے حالانکہ لغات عربی میں ہوس بفتح اول و دوم بمعنی جنون اور دیوانہ ہونے کے ہے۔ لہٰذا بوالہوس بمعنی نہایت آرزومند بڑا حریص۔''[1]

لیکن جناب رشید حسن خاں ایک بار پھر فرہنگ جہاں گیری اور برہان قاطع سے رجوع کرتے ہیں۔ فرہنگ آثر بھی انھیں مفید مطلب معلوم ہوتی ہے کیونکہ آثر لکھنوی ''بلہوس'' لکھا کرتے تھے اور اسی کو انھوں نے صحیح مانا ہے۔ بوالعجب اور بوالفضول کی صحت کے بارے میں نہ اختلاف تھا نہ شبہہ۔ یہ کمی ایران کے جدید

---

[1] نور اللغات' جلد اول' ص ۶۴۴

فرہنگ نویسوں نے پوری کی جو اس باب میں مختلف وجوہ سے خود ایران کے ان قدیم تصرفات کو قبول نہیں کرتے جو عربی کے زیر اثر ہوئے تھے۔ احمد بہمنیار نے ''املای فارسی'' میں بوالہوس، بوالعجب اور بل الفضول تینوں کو غلط قرار دیا ہے۔ چنانچہ جناب رشید حسن خاں بھی اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں:

''......ان مرکبات کا پہلا جز 'بل' ہے جو فارسی کا کلمہ ہے۔ صحیح بات یہی ہے اور ان کلمات کو واو کے بغیر لکھنا چاہیے، یعنی بل ہوس، بل ہوی، بل عجب، بل عجبی، بل فضول۔''[1]

آثر لکھنوی نے بوالہوس کے ذیل میں نوراللغات کے اندراج سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اس معاملے میں قاموس الاغلاط کے مصنفین کے ہمنوا ہیں اور یہ بھی کہ:

''میں نے اکثر قلمی کتابوں میں املا بلہوس بجائے بوالہوس لکھا دیکھا ہے اور سب کچھ جانے دیجیے بلحاظِ سہولت تحریر بلہوس کو بوالہوس پر ترجیح ہے جب یہ املا بلحاظ معنی بھی ہو سکتا ہے۔''[2]

قاموس الاغلاط کے مؤلفین نے اردو کے چلن کے خلاف بے شمار عربی و فارسی الفاظ کے تلفظ اور معنی کو غلط بتایا ہے لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ یہ لکھنے کے باوجود کہ

''بوالہوس اصل میں بلہوس فارسی ہے۔''[3]

یہ نہیں لکھا کہ بوالہوس غلط ہے۔ معلوم نہیں قلمی کتابوں کے ذکر میں آثر مرحوم کی

---

[1] اردو املا، ص ۲٦٨ [2] فرہنگ آثر از آثر لکھنوی، ۱۹٦۱، ص ۲۰۴ [3] قاموس الاغلاط از مولانا سید مختار احمد و مولانا ذہین، ص ۲۴

''اکثر'' سے کیا مراد ہے۔ لیکن عام طور پر ''بوالہوس'' ہی لکھا جاتا ہے اور اس کے لکھنے میں کوئی خاص دشواری بھی نہیں۔ بوالعجب اور بوالفضول کے املا میں کوئی اختلاف نہیں۔ اردو میں ان تمام الفاظ کا مروّج املا ہی صحیح ہے۔ بالفرض یہ ترکیبیں تحقیق کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں تو نہ اتریں اردو میں اسی طرح لکھی گئی ہیں اور لکھی جاتی ہیں۔ اردو میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو بل بمعنی بسیار کے ساتھ لکھا جاتا ہو۔ خود رشید حسن خاں صاحب کی کتاب میں ایک جگہ ''بوالعجبیاں'' لکھا ہوا ہے[۱] اور یہی درست ہے۔ ان الفاظ کو دوسری طرح لکھنا نہ صرف املا کی غلطی ہے بلکہ اردو کے ساتھ بڑی ناانصافی ہے۔

اصول یہ نکلا کہ عربی و فارسی الفاظ و تراکیب اور ان کے املا کو اب عربی و فارسی کی قدیم فرہنگوں یا جدید تحقیقات لغت کی روشنی میں نہ دیکھا جائے گا۔ بلکہ یہ پہلو پیش نظر رکھا جائے گا کہ اردو میں وہ الفاظ و تراکیب کس صورت میں آئے اور انھوں نے اپنی کیا صورت برقرار رکھی۔ فارسی کے جو الفاظ معرّب ہو کر یا عربی کے جو الفاظ مفرّس ہو کر اردو میں داخل ہوئے ان کے املا میں اگر اصل کے مطابق بعد میں ترمیم نہیں ہوئی تو ان کی معرّب یا مفرّس صورتیں ہی قابلِ قبول ہوں گی۔ فارسی یا عربی کی جدید تحقیقات لغت اور ترمیمات املا سے اردو املا کی حد تک ہمیں کوئی غرض نہ ہوگی۔

۱۔ اردو املا ص ۶۴۴

الف اور ہائے مختفی

ہندی الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی کے بجائے الف لکھنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ ہندی میں ہائے مختفی جیسا کوئی حرف نہیں ہے۔ ہندی الفاظ تو ایک طرف رہے کعبہ' آئینہ' بندہ' جامہ اور مرثیہ جیسے الفاظ بھی ہندی میں لکھیں جائیں گے تو ان کے آخر میں 'آ' کی ماترا آئے گی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہندی کے وہ الفاظ جن کے آخر میں 'آ' ہے ہائے مختفی سے لکھے ہی نہیں جا سکتے۔ ہندی کے بعض الفاظ میں الف کی قدرے خفیف آواز نکلتی ہے لیکن رسمِ خط میں اس کے اظہار کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے الف کی پوری آواز اور اس آواز کے املا میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو رسمِ خط میں ہائے مختفی اسی آواز کی علامت ہے۔ اردو میں ان الفاظ میں الف اور ہائے مختفی کا ادلا بدلا بھی ہوتا ہے بلکہ اس کا اثر بعض عربی و فارسی الفاظ پر بھی پڑا ہے مثلاً تمغہ' معمہ' تماشہ اور قورمہ وغیرہ۔ پھر بھی اصول یہ ٹھیک ہوگا کہ اکثر ہندی الفاظ کو اور بعض عربی و فارسی الفاظ کو اصل کی رو سے ہائے مختفی کے بجائے الف سے لکھا جائے۔ تمام الفاظ کو ایک لکڑی سے نہیں ہانکا جا سکتا۔ الف کی خفیف آواز اور اردو کے عام رواج کو دیکھتے

ہوئے مستثنیات کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی رائے میں جن الفاظ کو الف سے لکھنا چاہیے ان کی ایک اچھی خاصی فہرست ان کے مضمون ''اردو املا'' میں موجود ہے۔ جناب رشید حسن خاں نے اپنی کتاب میں اس خیال سے کہ ''ایسے الفاظ میں غلط نگاری بہت راہ پا گئی ہے'' ایک بڑی مفصل فہرست دی ہے۔ اس میں بکثرت الفاظ ایسے ہیں جن کے املا میں اب شاید کوئی اختلاف نہیں ہے مثلاً اجالا' پتا' اکھاڑا' انڈا' انا' بودا' پھاہا' ٹانکا' جوا' چھلاوا' دکھڑا' سہرا' کچوکا' گچھا' گنا' لاکھا' لنکا' لوٹا' مالا' نالا' نکیلا' ہتوڑا' ہریالا وغیرہ۔

مندرجہ ذیل الفاظ اور اس قبیل کے دوسرے الفاظ کو اس قاعدے سے مستثنا قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا:

آنہ، اک منزلہ، بادلہ، بدلہ (ادلا کے ساتھ ادلا بدلا)،
برآمدہ، بدقومہ، بزدلہ، بنگلہ، پچ محلہ، پیسہ، تسالہ، تکیہ،
تمابہ' تھانہ، چاؤلہ (نام)، چورابہ، چوطرفہ، خاکہ،
خرچہ، خوجہ، دوالہ، دوالیہ، دوانہ، دہریہ، ڈاکیہ، ڈھانچہ،
شوالہ، کھاتہ، کھنہ (نام)، کوئلہ، راجہ، روپیہ، زنانہ،
سکینہ (نام)، سمجھوتہ، لالہ (لالہ سری رام)، قورمہ،
لتہ (کپڑا کے ساتھ کپڑا لتا)، مارکہ، مرہٹہ، موٹا تازہ،
مورچہ، مہینہ، ندیدہ، نقشہ، ہرجہ، ہمالہ، ہمالیہ۔

جناب رشید حسن خاں نے ''پنجاب میں اردو'' اور ماثر الامراء'' کے

حوالے سے ہندی الفاظ کو ہائے مختفی کے بجائے الف سے لکھنے کے سلسلے میں فضائل خاں کی تجویز اور عالم گیر کے حکم کا ذکر کیا ہے۔ گویا یہ قاعدہ تین سو سال سے بھی زیادہ پرانا ہے اور فضائل خاں کی زباں دانی اور عالم گیر کی اصابت رائے کا ثبوت ہے۔ حافظ محمود شیرانی کی رائے ہے کہ اسی کے زیرِ اثر شاہی دفاتر کے باہر اردو خواں لوگ کئی الفاظ کو ہائے مختفی کے بجائے الف سے لکھنے لگے مثلاً لہوڑا' چونا' سہرا' بجنا اور ہیرا وغیرہ۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ عالم گیر کے فرمان کے باوجود بنگالا اور مالوا ایک بار پھر بنگالہ اور مالوہ کیوں ہو گئے۔

سرمایۂ زبانِ اردو' امیر اللغات' فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات میں بلاشبہ اسی اصول کے تحت ہندی کے اکثر الفاظ و مرکبات کو ہائے مختفی کے بجائے الف سے لکھا گیا ہے۔ ان میں سے پہلا لغت تقریباً سو سال اور آخری لغت ساٹھ سال پہلے شائع ہوا تھا۔ اتنے طویل عرصے کے بعد بھی اگر بہت سے الفاظ کو ان لغات کے مطابق لکھنے کا چلن نہیں ہوا تو اس کی تہ میں ضرور کوئی بات ہو گی۔

جناب رشید حسن خاں نے لکھا ہے:

> "اردو لغت نویسوں نے اس قاعدے کی صراحت تو نہیں کی ہے
> مگر ہندی و انگریزی کے اکثر لفظوں کو لغات میں الف ہی سے
> لکھا ہے اس سے انکی رائے کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔"[1]

---

[1] اردو املا' ص ۸۹

لیکن نور اللغات میں اس قاعدے کی صراحت موجود ہے۔ آنا کے معنی میں آٹھویں نمبر پر لکھا ہے:

"روپے کا سولہواں حصہ، جائداد کا سولہواں حصہ"۔ ان معنی میں ہائے مختفی کے ساتھ (آنہ) تحریر میں مروج ہو گیا ہے لیکن ہندی لفظ ہے۔ قاعدہ سے الف سے لکھنا چاہیے۔"[۱]

لغت نگار کا کام یہ نہیں ہے کہ املا یا زبان کا کوئی قاعدہ بنا کر لغت کے ذریعے سے اسے نافذ کرنے کی کوشش کرے۔ اس کو مروجہ املا اور زبان کو دیکھنا چاہیے اور لغت میں جگہ دینا چاہیے۔ ترجیح کا فیصلہ دینے کا ضرور اسے حق ہے۔ جب بھی اس اصول کی خلاف ورزی کی جائے گی لغوی املا اور زبان' اور مروجہ املا اور زبان میں خلیج واقع ہو جائے گی اور لغوی املا اور زبان لغت کے صفحات میں بند ہو کر رہ جائے گی۔ جہاں تک یہ اصلاح چل سکتی تھی وہاں تک کامیاب ہوئی۔ جن موقعوں پر مذکورہ لغت نگاروں کی روش مروجہ املا کے خلاف تھی ان موقعوں پر اکثر فطری طور پر وہ خود الجھ کر رہ گئے۔ لغت تو انھوں نے الف سے قائم کر دیا لیکن معنی میں کہیں تو یہ صراحت کر دی کہ اس لفظ کا املا ہائے مختفی سے بھی صحیح ہے اور کہیں اس صراحت کے بغیر لفظ کو ہائے مختفی سے بھی لکھ دیا۔ جا بجا یہ بھی ملتا ہے کہ ایک فصل میں تو لفظ الف سے ہے اور دوسری فصل میں ہائے مختفی سے۔ مثلاً فرہنگ آصفیہ میں 'ت' کی فصل میں "تولا" اور اس کے بعد "تولا ماشا" لکھا ہوا ہے اور تولا کے ذیل میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ یہ لفظ بہ ہائے ہوز بھی لکھا جاتا ہے۔[۲] لیکن میم

---

۱ نور اللغات' جلد اول' ص ۱۰۸ ۲ فرہنگ آصفیہ' جلد اول' ص ۶۳۹

کی فصل میں ماشہ اور اس کے بعد ''ماشہ بھر'' اور ''ماشہ تولہ ہونا'' درج ہے۔ یہاں یہ صراحت نہیں کی کہ ان الفاظ کو الف سے بھی لکھتے ہیں یا ان کا لکھنا الف سے درست ہے۔ ماشہ تولہ ہونا کی مثال میں ایک شعر اور ایک مصرع دیا ہے۔ اس کی بھی یہ صورت ہے کہ شعر کے دوسرے مصرع میں تولہ ہے اور ماشا' تماشا کے قافیے کے طور پر آیا ہے جس سے املا کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مصرع میں ماشا اور تولا لکھا ہوا ہے:

مزاج کیا ہے کہ اک تماشا گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشا

ماشا گھڑی میں تولہ ہے زردار کا مزاج [1]

دانہ پانی کی مثال اور بھی پریشان کن ہے۔ سرمایۂ زبان اردو میں 'دانا پانی' اور اسیر لکھنوی کا یہ شعر درج ہے:

کھینچ لاتا ہے قفس تک ہمیں دانا پانی دیکھیے دانا فلک بند کرے یا پانی [2]

فرہنگ آصفیہ میں دانہ پانی ہے اور اسی کے مطابق اسیر لکھنوی کا شعر یوں لکھا ہے:

کھینچ لاتا ہے قفس تک ہمیں دانہ پانی دیکھیے دانہ فلک بند کرے یا پانی [3]

---

[1] فرہنگ آصفیہ' جلد چہارم' ص ۲۶۲۔ جناب رشید حسن خاں کے مطابق فرہنگ آصفیہ' نور اللغات اور سرمایۂ زبان اردو میں تولا ماشا کو اردو مرکب بتایا گیا ہے اور دونوں لفظوں کو الف سے لکھا گیا ہے (اردو املا' ص ۱۰۴) فرہنگ آصفیہ کی حد تک یہ بیان پوری طرح صحیح نہیں۔

[2] سرمایۂ زبان اردو از جلال لکھنوی' ص ۲۰۰ [3] فرہنگ آصفیہ جلد دوم' ص ۲۲۹

سرمایۂ زبان اردو میں ''دانا بدلنا'' کے معنی میں لکھا ہے:

''جانوروں کا ایک دوسرے کو باہم دانہ کھلانا۔''[۱]

فرہنگ آصفیہ میں دوالا' دوالا نکلنا تو اسی طرح الف سے درج ہیں لیکن دوالیہ ہائے مختفی سے درج ہے اور معنی میں دوالہ لکھا ہے:

''دوالیہ۔ ہ۔۔۔۔۔ وہ شخص جس کا دوالہ نکل گیا ہو۔''[۲]

سرمایۂ زبان اردو اور نور اللغات میں بدلا ہے لیکن فرہنگ آصفیہ میں بدلہ۔ نور اللغات میں پہلے بتاسا دیا ہے اور آگے چل کر بتاشہ۔ نور اللغات میں بد کانہ' براندہ' بسوہ' بسوا دیا ہے۔ بلوہ کو عربی بتایا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں بلوا کو اردو بتایا ہے اور بلوہ کو فارسی' اور بلوۂ عام بھی درج کیا ہے۔

جناب رشید حسن خاں نے ''پیسا'' کی تائید میں امیر اللغات سے یہ مثل نقل کی ہے:

''اپنی گانٹھ نہ ہو پیسا تو پرایا آسرا کیسا''[۳]

لیکن یہاں پیسا' کیسا کی رعایت سے آیا ہے اور اس لفظ کا صحیح املا پیسہ مان لینے کی صورت میں بھی اس مثل میں پیسا ہی لکھا جائے گا۔ انھوں نے لتہ کا صحیح املا لتّا قرار دیا ہے اور کپڑ لتّا کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس لفظ کا صحیح املا لتہ ہے اور فرہنگِ آصفیہ میں بھی یہی دیا ہے لیکن کپڑا کی رعایت سے یہ ''کپڑ لتّا'' میں لتّا ہو جائے گا۔ اس

---

[۱] سرمایۂ زبان اردو' ص ۲۰۰ [۲] فرہنگ آصفیہ جلد دوم' ص ۲۷۸ [۳] اردو املا' ص ۹۴

طرح کی مثالوں سے مفرد لفظ کے صحیح املا پر اثر نہیں پڑ سکتا۔ لتّہ کے سلسلے میں بھی مثل ہے:

''بدن پر نہیں لتّہ پان کھاؤں البتہ''[۱]

اگر چہ یہاں نری قافیے کی پابندی نہیں ہے لیکن جناب رشید حسن خاں جب یہ مثل لکھیں گے تو انھیں بھی لتّہ لکھنا پڑے گا۔ اگر لتّا لکھ دیا جائے گا تو مثل کا لطف ہی ختم ہو جائے گا۔

بہر حال اس قبیل کے الفاظ میں لغات کے اندراجات یا مرکبات و امثال میں ان کے استعمال سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ جن الفاظ کے املا میں شک کا کوئی پہلو نہیں ہے ان کے غلط املا کو ترک کر دینا لازمی ہے۔ مثلاً دانہ۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ دانہ پانی اور اور دانہ بدلنا وغیرہ میں ''دانا'' لکھا جائے۔ دیگر الفاظ میں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہائے مختفی ہے ان کا مروجہ املا اس وجہ سے تو نہیں ہے کہ ان کا تلفظ الف کے بجائے ہائے مختفی سے زیادہ قریب ہے۔ اگر ایسا ہو تو ان کے مروجہ املا میں ترمیم نہ کرنا چاہیے۔ مرکبات و امثال میں کسی رعایت کی وجہ سے لفظ کا املا مختلف ہو سکتا ہے لیکن مفرد صورت میں املا اصل کے مطابق ہی رہے گا۔ ایسے مرکبات کو جن کا آخری جزو عربی یا فارسی ہو انھیں زبانوں کی رعایت سے ہائے مختفی سے لکھنا چاہیے خواہ پہلا جزو ہندی یا اردو ہی کیوں نہ ہو۔

---

[۱] لغات اردو از عشرت لکھنوی، جلد چہارم، ص ۷

ہندی الفاظ کو ان کی قیاسی اصل کی بنا پر اردو میں لکھنے کا اصول بڑی سختی
سے بنایا جاتا ہے لیکن جب عربی الفاظ کا معاملہ آتا ہے تو اصل سے قطع نظر کر کے
ہمزہ اور ی کو اردو املا سے خارج کرنے کا قاعدہ بنایا جاتا ہے۔ اگر اعتدال کے
ساتھ عمل کیا جائے تو اس میں کوئی خاص مضائقہ نہیں لیکن ہمیں اس بھول میں نہ
پڑنا چاہیے کے یہ رویہ منطقی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قاعدے نئے ہوں یا پرانے
زبان کے معاملے میں منطق ایک حد تک ہی چلتی ہے۔ یہ کوئی معقول طریقہ نہیں
کہ کہیں تو اصل کا واسطہ دے کر کسی مروج لفظ یا اس کے املا کو معتوب قرار دیا جائے
اور کہیں اردو کے نام پر اصل کی گردن ماری جائے اور نقصان دونوں صورتوں میں
اردو کا ہو۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ زبان کا ڈھانچا اس وقت کیا ہے اور اس کی انفرادیت'
مزاج اور چلن کو مدِّ نظر رکھ کر کس حد تک ترمیم و تنسیخ قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔

ہائے ملفوظِ متصل

ہائے ملفوظِ متصل جہاں لفظ کی ابتدا یا درمیان میں آتی ہے وہاں نہ تو کوئی دشواری ہے اور نہ کوئی اختلاف مثلاً ہندی' آگہی اور تندہی وغیرہ۔ بظاہر مشکل وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں ہائے ملفوظِ متصل لفظ کے آخر میں آتی ہے۔ اردو میں اس کے لکھنے کی دو صورتیں مروج مانی جائیں گی۔(۱) کہہ، بہہ، سہہ وغیرہ اور (۲) یہ، بہ (بمعنی اچھا)، مہ، جگہ وغیرہ۔اول الذکر پر یہ اعتراض ہے کہ دو 'ہ' لکھ دی جاتی ہے جبکہ دراصل ایک 'ہ' ہے۔بعض الفاظ میں دو 'ہ' کے لیے اسی طرح لکھا جاتا ہے مثلاً قہقہہ، شبہہ۔اس کے علاوہ اگر کہہ، بہہ اور سہہ کے اندازِ املا پر قیاس کیا جائے تو یہ، بہ اور جگہ کو بالترتیب یہہ، بہہ اور جگہہ لکھنا چاہیے لیکن ان الفاظ کو یا اس طرح کے دوسرے الفاظ کو یوں لکھنا اب متروک ہے۔ جناب رشید حسن خاں نے ہائے مختفی اور ہائے ملفوظ میں امتیاز کے لیے یہ صورت اختیار کی ہے کہ لفظ کے آخر میں جب ہائے ملفوظ متصل آتی ہے تو اس کے نیچے 'ہ' کا شوشہ لگایا ہے مثلاً کہٖ' بہٖ' یہٖ' مہٖ' جگہٖ' وغیرہ۔لیکن لفظ کے آخر میں ہائے ملفوظِ متصل کے نیچے شوشہ لگانے کا اب دستور نہیں' پہلے بھی کہیں کہیں ملتا ہے۔ ہائے ملفوظِ متصل کے

لیے شوشہ ایک بالکل مختلف تلفظ کے لیے لگایا جاتا ہے جس میں یہ شوشہ حرف ماقبل کی حرکت قبول کرنے کے بجائے خود ہائے ملفوظ کی حرکت قبول کرتا ہے اور ''ہِی'' کی آواز دیتا ہے مثلاً بجنہٖ' بعینہٖ' بفضلہٖ وغیرہ۔ چونکہ یہ ایک مسلمہ طریقہ ہے اس لیے 'یۂ' 'بۂ' 'مۂ' وغیرہ کی ہائے ملفوظ کے نیچے شوشہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو بالترتیب یہی' بہی اور مہی وغیرہ پڑھا جائے جو قطعاً غلط ہوگا۔ ایک شوشہ جو ایک حرف پر ایک آواز کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی شوشے کو دوسری آواز کے لیے استعمال کرنا جبکہ اس کا چلن بھی نہ ہو کسی طرح درست نہیں۔

جہاں تک یہ کو یۂ لکھنے کا تعلق ہے یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اس لفظ میں اردو تلفظ کے مطابق 'ہ' کے بجائے 'ی' کی آواز نکلتی ہے اسی طرح توبہ[1] میں بالکل ہائے مختفی کا تلفظ ہوتا ہے مثلاً

زاہد کا دل نہ خاطرِ مے خوار توڑیے
سو بار توبہ کیجیے سو بار توڑیے

توبہ توبہ میرے خوش فہموں کے تعریفی خطوط -
گاہے جی جلتا ہے گاہے شرم آتی ہے مجھے

املا نامہ میں 'یۂ' کے سلسلے میں نوٹ دیا گیا ہے:

---

[1] کبھی زیادہ اظہارِ برگشتگی کے لیے اس لفظ کا تلفظ ہائے ملفوظ سے کرتے ہیں یہاں تک کہ توباہ بھی بولتے ہیں لیکن اس سے اصل لفظ نہیں بدل سکتا۔

''یہ میں ہ کی آواز بہت کمزور ادا ہوتی ہے اس لیے یہ کو ہ کے شوشے کے بغیر لکھنا بھی صحیح ہے۔''[1]

واقعہ یہ ہے کہ ایسے الفاظ میں 'ہے' کا شوشہ لگانا نہ صرف ایک غیر ضروری اضافہ ہے بلکہ ان الفاظ کے تلفظ کو بدلنا ہے۔ ایک تو اس شوشے کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی آواز مختلف ہوتی ہے' دوسرے جن موقعوں پر 'یہ' کا تلفظ کھینچ کر کیا جاتا ہے ان موقعوں پر اور بھی قباحت ہے۔ مثلاً ان مصرعوں میں

نہیں ہے وقت مری جان یہ تامل کا	سودا
یہ باتیں ہیں ادھر کو مزاج اس کا کب آیا	میر
پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے	ذوق
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا	غالب
درِ میخانہ یہ رہا مجروح	مجروح
یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش	ریاض

ان مقامات پر یہ کو اعلان کے ساتھ پڑھنا اردو کا طریقہ نہیں ہے۔ جو متون شوشے کے ساتھ ترتیب دیے گئے ہیں وہ نہ صرف ساقط المعیار ہیں بلکہ غلط ہیں۔

یہ شوشہ کتابت میں بھی بدنما معلوم ہوتا ہے خصوصاً ایسے الفاظ میں جن میں ہائے ملفوظ متصل کے پہلے کے حرف' یا خود اس کے نیچے حرکت یا نقطہ ہوتا ہے یا اضافت کا زیر بھی آتا ہے۔ جب یہ سب صورتیں یکجا ہو جاتی ہیں تو الفاظ بہت

---

[1] املا نامہ' ص ۵۹

بھدے اور گنجلک معلوم ہوتے ہیں اور ان کی تصویریں ان تصویروں سے بالکل مختلف ہو جاتی ہیں جن سے نگاہیں آشنا ہیں۔ خود "یہ" کی صورت اچھی نہیں معلوم ہوتی چہ جائیکہ بہ (بمعنی اچھا) توجہ، توجیہہ، نگہ، یار، فقہ ہندی وغیرہ۔

مختصر یہ کہ ہائے ملفوظ متصل جب لفظ کے آخر میں آئے تو اسے ہائے مختفی ہی کی طرح لکھا جائے۔ عام طور پر الفاظ کے لکھنے کی یہ صورت ہوگی:

یہ ، مہ ، منہ ، جگہ ، تشبیہ ، مشابہ ، فقہ ، فقیہ

بہ اور بہ (بمعنی اچھا) اور نہ اور نہ (بمعنی نو) میں موخر الذکر کو بہ اور نہ لکھ کر التباس دور کیا جا سکتا ہے۔ کہنا، بہنا اور سہنا کے امر کو مستثنا قرار دے کر مروج املا کے مطابق کہہ، بہہ اور سہہ لکھا جائے۔ جن الفاظ کے آخر میں دو 'ہے' ہیں ان کو بدستور لکھا جائے مثلاً قہقہہ، شبہہ۔ ہائے ملفوظ متصل کے نیچے شوشہ صرف ایسے الفاظ میں لگایا جائے جن کے آخر میں ہائے ملفوظ کا تلفظ "ہی" کی طرح ہوتا ہے مثلاً بذاتہٖ، بعینہٖ وغیرہ۔

اضافت

جناب رشید حسن خاں نے اردو املا میں لکھا ہے:

''اضافت کا قاعدہ بہت سادہ اور صاف ہے کہ لفظ کے آخر میں حرف پر زیر آجاتا ہے۔''[1]

''اردو کیسے لکھیں'' میں بھی ان کے الفاظ ہیں:

''اضافت کی صورت میں لفظ کے آخری حرف پر زیر آجاتا ہے۔ یہ مانا ہوا قاعدہ ہے۔ منزل اور زندگی دو لفظ ہیں۔ اضافت کی صورت میں مثلاً ''منزلِ مقصود'' لکھا جائے گا، اگر اس کو 'منزلَ مقصود' لکھا جائے تو ہر شخص یہی کہے گا کہ املا غلط ہو گیا۔ اسی طرح زندگیِ جاوید لکھا جائے گا۔ اس کو اگر زندگیَ جاوید لکھا جائے تو 'منزلَ مقصود' کی طرح اس کا املا بھی غلط ہو جائے گا۔ مگر ایسی غلطیاں اکثر دیکھنے میں آتی رہتی ہیں۔''[2]

موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ

''جن لفظوں کے آخر میں ی یا ے ہو (خواہ اصلی یعنی جزوِ لفظ ہو خواہ اضافی) اضافت کی صورت میں 'وہ ی مکسور ہو جائے گی' اس پر ہمزہ ہرگز نہیں لکھا جائے گا مثلاً مبتلائے غم' رعنائی خیال یا مرضیِ خدایا زندگیَ عیش لکھنا غلط ہوگا کیونکہ یہاں ہمزہ فالتو

[1] اردو املا' ص ۴۰۰

[2] اردو کیسے لکھیں' ص ۱۳

ہی نہیں غلط بھی ہے۔ ایک آواز کے لیے دو حرف یکجا نہیں
کیے جائیں گے۔ صحیح املا: مرضیِ خدا، مبتلاے غم، زندگیِ عیش،
رعنائیِ خیال ہوگا ایسے مقامات پری پر ہمزہ لکھنا غالب کے
الفاظ میں عقل کو گالی دینا ہے۔"[۱]

معلوم نہیں یہ مانا ہوا قاعدہ کہاں کا ہے کہ اضافت کی صورت میں لفظ کے آخری حرف پر صرف زیر آ جاتا ہے۔ غالباً یہ قاعدہ اتنی قطعیت کے ساتھ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ لوگ ادھر اُدھر نہ دیکھیں اور آنکھ بند کر کے اضافت کی صورت میں صرف زیر لکھنے لگیں، حالانکہ کئی دوسرے موقعوں کی طرح اضافت کی صورت میں ہمزہ کو خارج کرنے کی اچھی خاصی مہم چلانے کے باوجود جناب رشید حسن خاں کو خود یہ لکھنا پڑا ہے کہ

"اضافت کے لیے ہمزہ صرف ایک صورت میں آتا ہے جبکہ لفظ
کے آخر میں ہاے مختفی ہو۔ جیسے نامۂ شوق، کعبۂ مقصود۔"[۲]

ایک اور جگہ اسی ضمن میں تجویز کو قاعدے کے سانچے میں ڈھال کر لکھتے ہیں:

"اس صورت کے علاوہ اور کسی بھی جگہ یہ علامت (........) کی
حیثیت سے نہیں آتا۔ باقی ہر جگہ یہ مستقل حرف ہوتا ہے۔"[۳]

ظاہر ہے کہ اگر ایک صورت میں بھی ہمزہ آتا ہے تو اضافت کے قاعدے سے اس کو خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اردو املا، ص ۳۰۱ ۲۔ اردو املا، ص ۳۱۴ ۳۔ اردو املا، ص ۳۵۱

قاعدے کی حقیقت تو یہ تھی اب رواج کا بیان دیکھیے ۔ جناب رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

"اردو میں رواج یہ رہا ہے کہ اضافت کی علامت کے طور پر ے کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے ابتداے عشق۔"[1]

قاعدے کے بیان کی طرح یہاں بھی پوری حقیقت کو سامنے لانے سے دیدہ و دانستہ گریز کیا گیا ہے ورنہ اتنا ہر شخص جانتا ہے کہ رواج یہ رہا ہے اور اب بھی ہے کہ اضافت کے لیے ے کا اضافہ کر کے اس پر ہمزہ لایا جاتا ہے مثلاً ابتدائے عشق۔

لام پر ہمزہ بطور اضافت (منزلٔ مقصود) کی مثال دے کر انھوں نے بڑا ستم کیا ہے کیونکہ اردو میں اس طرح لکھنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے لیکن یہ انداز ان کے یہاں دوسرے موقعوں پر بھی پایا جاتا ہے مثلاً الفاظ کو ملا کر لکھنے کی بحث میں رقم طراز ہیں :

"پھر یہ بھی دیکھیے کہ ایسے حرف بھی تو ہیں جو اپنے بعد آنے والے حرف سے ملا کر لکھے ہی نہیں جا سکتے؛ جب یہ حرف بیچ میں آ جاتے ہیں تو لفظ خود بخود ٹوٹ جاتا ہے اور دو یا زیادہ ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے جیسے: فرفراور بڑھاؤں گا جو لوگ لکھینگے لکھنے پر اصرار کرتے ہیں وہ بڑھاؤں گا کو کس طرح

---

[1] اردو املا ص ۴

لکھیں گے؟ اور پڑھ رہا ہوں کو کیا پڑھر رہا ہوں لکھنا پسند کریں گے؟ اور کیا کمقسمت لکھنا گوارا کریں گے؟"[1]

جو حرف ملا کر لکھے ہی نہیں جا سکتے ان کو کوئی ملا کر لکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ جو حضرات "لکھینگے" لکھنے پر اصرار کرتے ہیں ان کا ذکر بھی غیر متعلق ہے کیونکہ اردو املا اب اس منزل پر اٹکا ہوا نہیں ہے بلکہ اب تو وہ دوسری انتہا پر ہے۔ جو لوگ "لکھینگے" لکھنے پر اصرار کرتے ہیں وہ پڑھوں گا کو بہ آسانی 'پڑھونگا' لکھیں گے۔ لیکن اس طرح کے سوال وجواب میں پڑنا تحصیل حاصل ہے۔ اگر کچھ لوگ اپنی روش خط بدلنے سے معذور ہیں یا مختلف اسباب سے املا کی غلطیوں پر قابو پانا مشکل ہے، خواہ غلطیاں پرانے پن کی پیدا کردہ ہوں یا جدّت پسندی کی زائیدہ، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اردو میں صحتِ املا کا کوئی مروّج تصوّر ہی نہیں ہے۔ "کمقسمت" لکھنا گوارا نہیں کیا جا سکتا تو اس سے "کمزور" لکھنے کی نفی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اگر "منزلِ مقصود" جیسی فرضی مثال غلط ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ زندگیٔ جاوید بھی غلط ہے۔

اردو میں علامت اضافت زیر بھی ہے اور ہمزہ بھی اور کسی حد تک دونوں کے استعمال کے موقعے متعین ہیں۔ اگر لکھنے والے احتیاط نہیں برتتے اور زیر کی جگہ ہمزہ اور ہمزہ کی جگہ زیر یا دونوں کا استعمال کر دیتے ہیں تو اس میں نہ زیر کا قصور ہے اور نہ ہمزہ کا۔ بائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ پر اضافت کی صورت

---

[1] اردو املا ص ۶۴

میں ہمزہ برقرار رہتا ہے اور زیر کے لیے جگہ نہیں خالی کرتا تو یہ آسانی تو ہوتی نہیں کہ علامتِ اضافت کے طور پر صرف زیر کو اختیار کرلیا جائے' اس لیے دوسرے موقعوں سے جہاں ہمزہ کے استعمال کا چلن ہے اس کو بے دخل کرنے کی کوشش فضول ہے۔

اردو میں اضافت کا قاعدہ یہ ہے کہ جن الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی یائے مجہول اور یائے معروف ہوتی ہے ان پر ہمزہ لایا جاتا ہے اور جن الفاظ کے آخر میں دیگر حروف ہوتے ہیں ان پر زیر لایا جاتا ہے۔ اس قاعدے میں استثنا کی صرف یہ صورت ہے کہ جن الفاظ میں ''ئی'' کا لاحقہ شامل ہوتا ہے ان کی یِ پر اضافت کی حالت میں زیر آجاتا ہے۔ اس استثنا کے ساتھ یائے مجہول ومعروف پر بہ صورت اضافت ہمزہ لانا اردو املا کے ساتھ مخصوص ہے۔ فارسی کی تقلید میں اس سے دست وگریباں ہونا نہ صرف اردو املا کے ساتھ ناانصافی ہے بلکہ خود اپنی قوت کو خواہ مخواہ ضائع کرنا ہے۔ غالبؔ نے تفتہؔ کے نام ایک خط میں ان مقامات پر ہمزہ لانے کو جو ''عقل کو گالی دینا'' کہا ہے وہ فارسی سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ جب ''ذال'' اور ''فہمائش'' کے بارے میں غالبؔ کی رائے قابلِ قبول نہیں تو ان کے اس قول پر زور دینا کیا ضرور ہے۔

ایران کی چھپی ہوئی فارسی کتابوں میں اب صرف ہائے مختفی پر اضافت دیکھنے میں آتی ہے مثلاً چہرۂ خویش' غنچۂ گل وغیرہ۔ دوسرے موقعوں پر نہ زیر کی علامت ملتی ہے اور نہ ہمزہ کی۔ یائے نسبتی بغیر ہمزہ کے یائے معروف ہوتی

ہے مثلاً پای جاناں، غزل ہای پر سوز وغیرہ۔ اضافت فارسی زبان کی ایک خاص چیز ہے۔ املا میں اس کے اظہار کے بغیر ایرانیوں کو شاید کوئی دشواری نہ ہوتی ہوگی۔ لیکن اردو کے لیے یہ ٹھیک نہیں ہوسکتا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ جب ہندوستان میں فارسی تعلیم اچھے خاصے پیانے پر ہوتی تھی اس وقت تو اردو میں یائے نسبتی پر ہمزہ ضروری سمجھا جاتا تھا لیکن اب جبکہ حالات بالکل مختلف ہیں کسی فارسی قاعدے کی تقلید میں اردو املا سے اسے کیونکر خارج کیا جاسکتا ہے۔

فارسی کی بات جانے دیجیے مجھے اس میں کلام ہے کہ ساکن الف کے بعد جہاں کسی لفظ میں واؤ اور یے آتے ہیں وہاں بغیر ہمزہ کے کوئی تلفظ کیا جا سکتا ہے۔ جماو اور بناو کے واؤ پر جب تک ہمزہ نہ ہو جماؤ (بھیڑ) اور بناؤ (آرائش) نہیں پڑھا جا سکتا۔ راے اور گاے کی یے پر بھی جب تک ہمزہ نہ ہو رائے اور گائے نہیں پڑھا جا سکتا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے 'دکھای' لکھ کر 'دکھائی' نہیں پڑھا جاسکتا۔ جناب رشید حسن خاں نے یہ صورت واؤ اور یے کے خفیف اور طویل تلفظ میں امتیاز کرنے کے لیے اختیار کی ہے یعنی جب واؤ اور یے کا تلفظ خفیف ہو تو ہمزہ نہ لایا جائے اور جب طویل ہو تو لایا جائے۔ لیکن یہ اردو املا کے خلاف ہے ایسی صورتوں میں طویل تلفظ کا اظہار ایک اور حرکت کے بغیر نہیں کیا جا سکتا اور یہ ایک نئی قباحت ہوگی۔ جماؤ (جمانا کا امر) کے بھی دو تلفظ ہیں' ایک خفیف اور دوسرا طویل. خفیف تلفظ بالکل وہی ہے جو جماؤ (بھیڑ) کا ہے۔ اس

لیے بھی ایک جگہ ہمزہ لانے اور دوسری جگہ نہ لانے سے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ خفیف اور طویل تلفظ جگہ جگہ ہوتا ہے۔ خاص طور سے شاعری میں وزن کے اعتبار سے الفاظ اپنی اصلی حالت کے ساتھ ساتھ کبھی کھینچ کر اور کبھی دبا کر پڑھے جاتے ہیں۔ ان تمام موقعوں کے لیے حرکات نہیں لگائی جاسکتیں۔ جس شخص میں موزونیِ طبع نہیں ہے اس کے لیے املا کچھ نہیں کرسکتا۔ نثر میں بھی الفاظ کی ملفوظی اور مکتوبی حالتوں میں مکمل مطابقت ممکن نہیں۔

اردو میں الف اور واؤ معروف پر ختم ہونے والے الفاظ میں اضافت کے لیے یے کا اضافہ کر کے اس پر ہمزہ نہ لایا جائے تو اضافت کا تلفظ ہی نہیں کیا جاسکتا مثلاً ''دریاے گنگا'' لکھیں گے تو یہ محض دو لفظوں کا مجموعہ ہوگا اور اس میں ''دریاے'' کے کوئی معنی نہ ہوں گے۔ اضافت اسی وقت رونما ہوگی جب دریاے کی یے پر ہمزہ لایا جائے گا۔ جناب رشید حسن خاں رائے جیسے الفاظ پر ہمزہ لانے کی اجازت نہیں دیتے' حالانکہ ان الفاظ میں ہمزہ جزوِ کلمہ ہے ' اور رائے عالی جیسی ترکیبوں پر بھی ہمزہ لانے کو بالکل غلط قرار دیتے ہیں۔ میری گزارش ہے کہ جہاں دو ہمزہ ہیں وہاں ایک کے لکھنے کی تو اجازت دیجیے' دوسرے کو مجبوراً محذوف سمجھ لیجیے یا ان ترکیبوں میں اظہارِ اضافت کے لیے یائے مجہول کے نیچے زیر لگائیے مثلاً رائےِ عالی۔ اظہارِ اضافت کی یہ صورت اُس صورت کے

مطابق ہوگی جس میں یائے معروف سے پہلے ہمزہ کی موجودگی کی وجہ سے یائے معروف کے نیچے زیر لایا جاتا ہے مثلاً رعنائیِ خیال۔

اضافت کی صورت میں بعض موقعوں پر ہمزہ کو زیر کا اور زیر کو ہمزہ کا قائم مقام سمجھنا چاہیے اور اس پھیر میں نہ پڑنا چاہیے کہ ہمزہ حروفِ تہجی میں سے ایک حرف بھی ہے اور ایک حرف کے اوپر دوسرا حرف کیسے آ سکتا ہے۔ ان موقعوں پر وہ حرف نہیں بلکہ حرکت ہے اور زیر کا بدل ہے۔ کچھ الفاظ میں ہمزہ ایک حرف کی حیثیت سے بھی آتا ہے لیکن وہاں اس کی نوعیت جداگانہ ہے۔ ہمزہ جب حرف کی حیثیت سے آئے گا تو اضافت کی حالت میں اس کے نیچے بلا تامل زیر لگایا جائے گا۔ کچھ دوسرے الفاظ کے آخر میں اصلاً ہمزہ ہے لیکن اردو میں خارج ہو چکا ہے اور یہ صورت قابلِ قبول ہے مثلاً شعراء کے بجائے' شعرا' علماء کے بجائے علما اور انشاء کے بجائے انشا وغیرہ۔ ان الفاظ میں اضافت کے لیے الف کے بعد یے کا اضافہ کر کے اس پر ہمزہ لایا جائے گا۔ اضافت کے لیے جن حروف پر زیر کے سوا ہمزہ لایا ہی نہیں جا سکتا وہاں کسی ترمیم کی حاجت نہیں ہے۔ دیگر حروف کے لیے سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ہمزہ اور زیر کے ادلے بدلے کی روش کو ترک کر کے کن مقامات کے لیے ہمزہ کو مخصوص کر دیا جائے اور کن مقامات کے لیے زیر کو۔ تحریر میں آسانی اور دیدہ زیبی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کا جواب دینا مشکل نہیں۔

اردو کے مرّجہ املا سے بغیر کسی خاص ترمیم و تنسیخ کے اضافت کے لکھنے کے حسب ذیل طریقے نکلتے ہیں جن پر پابندی سے عمل کیا جا سکتا ہے:

(۱) زلفِ یار، رخِ محبوب، مہرِ منوّر، ماہِ کامل، نظامِ زندگی، دلِ عاشق، مستعدِ کار، گردنِ مینا، آرائشِ جمال، جلوہ گہِ ناز، فقہِ ہندی۔

سروِ قامت، محوِ تماشا، پیروِ میرؔ، گروِ جم۔

مبدءِ فیاض، سوءِ ظن۔

(۲) رعنائیِ خیال، یکتائیِ معشوق، روائیِ آغاز، رسائیِ انجام۔

(۳) سردمہریِ معشوق، گل افشانیِ گفتار، بیگانگیِ خلق، مرضیِ خدا، زندگیِ فانی، سردیِ حنا، نفیِ حقائق، سعیِ لا حاصل۔

(۴) ابتدائے عشق، دنیائے فانی، سخت جانی ہائے تنہائی، علمائے کرام، آرائے گرام، رائے عالی، دعوائے بے دلیل، معمائے حیات۔

(۵) گیسوئے اردو، بوئے گل، سوئے چمن، جادوئے محمودؔ، آہوئے رم خوردہ، موئے آتش دیدہ، گوئے ظفر مندی، ہندوئے فلک، پہلوئے دوست، زانوئے آئینہ، ابروئے پرخم، گلوئے عشق، سبوئے شربت۔

(۶) نالۂ شوق ، کعبۂ مقصود ، غنچۂ آرزو ، آبلۂ پا ، خامۂ مژگاں ، عقدۂ خاطر ، قطرۂ خوں ، دیدۂ بینا۔

(۷) مئے پارینہ ، شئے لطیف ، پئے محمل ، درپئے آزار۔

جلال لکھنوی نے داغ کے دیوان کی تاریخ میں ''بوئے گلزار'' کے بجائے ''بوِ گلزار'' لکھا ہے۔۔ ع

بوِ گلزار داغ آئی آج

اگرچہ اس طریقے سے امیر مینائی کا اختلاف رشید حسن خاں کے سامنے تھا اور یہ امر بھی واضح ہونا چاہیے تھا کہ اس مصرع میں محض مادۂ تاریخ کے حصول کے لیے یے کو حذف کیا گیا ہے' نیز ضرورتِ شعری کی بنا پر بھی ایسی مثالیں الشاذ کا لمعدوم کا حکم رکھتی ہیں، لیکن وہ اس قسم کی مثالوں سے عام قاعدہ بنانے میں تامل نہیں محسوس کرتے۔ دوحرفی الفاظ کو تو انھوں نے بھی اس سے مستثنا رکھنا چاہا ہے لیکن دوسرے الفاظ میں ایسی صورت میں کہ واوٗ معروف خوب کھینچ کر نہ پڑھا جاتا ہو اس اندازِ نگارش کو جائز قرار دیا ہے بلکہ ان کی ذاتی پسند کے لحاظ سے یہ زیادہ مناسب ہے مثلاً :

گیسوِ تابدار کو اور بھی تابدار کر — اقبال

قبلہ وابروبت یک رہِ خوابیدۂ شوق — غالب

عکسِ چشم آہوِ رم خوردہ ہے داغِ شراب

میں گرفتار خم گیسو صیاد رہا — مومن

طلسم جادوِ بابل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں[1]

لیکن ان تراکیب کو اس طرح لکھنا بالکل غلط ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ املا میں جا و بے جا ترمیم کرنے کے ساتھ ساتھ متن میں ترمیم کرنے کی طرف ان کا رجحان کتنا بڑھا ہوا ہے اور ان کی یہ روش کس قدر انتشار کا باعث ہو رہی ہے۔ وہ انتشار کو دور کرنا چاہتے ہیں لیکن خود کسی نظم وضبط میں رہنے کو تیار نہیں۔ اضافت کی حالت میں سرو، خدیو، دیو، گرَو جیسے الفاظ کے واؤ پر تو زیر آ جاتا ہے لیکن واؤِ معروف و مجہول پر یے کا اضافہ لازمی ہے۔ واؤ معروف اگر زیادہ کھینچ کر پڑھنے میں نہیں آتا تو اس کی بنا پر یے کو حذف نہیں کیا جا سکتا۔ مادۂ تاریخ کے حصول کے لیے کبھی کبھی اس کو روا رکھنا ایک بالکل مختلف بات ہے۔ اوپر کے مصرعوں میں اصل مآخذ میں گیسوئے تابدار، ابروئے بت، آہوئے رم خوردہ، گیسوئے صیاد اور جادوئے بابل لکھا ہوا ہے یعنی یے ہر جگہ موجود ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ شعر میں الفاظ زیادہ کھنچ کر آئیں یا کم کھنچ کر یا دب کر ان کے املا میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔

---

[1] اردو املا، ص ۴۱۱، ۴۱۲ —— اردو کیسے لکھیں میں یہ قاعدہ ص ۸۱ پر ۸ کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

امالہ

امالہ کے لغوی معنی ہیں مائل کرنا۔ اصطلاح قواعد میں زبر کو زیر کی طرف مائل کرنے کو کہتے ہیں۔ الفاظ کے آخر کی ہائے مختفی عموماً محرّف صورت میں یائے مجہول سے بدل جاتی ہے اور حرف ماقبل زبر کے بجائے زیر سے پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح کچھ الفاظ کے آخر کا الف بھی یائے مجہول سے بدل جاتا ہے۔ جناب رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''جب لفظ کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے تو محرّف صورت میں اس لفظ کے آخر میں یے آجاتی ہے جیسے کعبہ اور کعبے سے .... اس کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیے کہ ایسی صورت میں ہمیشہ لفظ کو یائے مجہول کے ساتھ لکھا جائے ورنہ املا غلط ہو جائے گا یعنی 'کعبہ میں' غلط املا ہے۔ صحیح املا ہے 'کعبے میں'۔ کچھ لفظوں کے آخر میں الف بھی محرف صورت میں یے سے بدل جاتا ہے جیسے: گھوڑا اور گھوڑے پر۔ سہارا اور سہارے کے بغیر۔''[۱]

ایک اور موقع پر 'مرثیہ میں' اور 'پردہ نے' کو بالکل غلط لکھاوٹ قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ـــــ

[۱] اردو کیسے لکھیں، ص ۸۹

''ایسے لفظ جب منادا ہوں گے تب بھی ہائے مختفی یائے مجہول

سے بدل جائے گی جیسے:

اے صرصرِ دہر برباد دے گی نہ نازاں ہوائے غنچے اک مشتِ زر پر

غنچے ! تری زندگی پہ دل ہلتا ہے بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے''[1]

اس میں شک نہیں کہ یہ امالے کا عام قاعدہ ہے۔ یہ اصول بھی صحیح ہے کہ جس طرح بولتے ہیں اسی طرح لکھنا بھی چاہیے لیکن کوشش کے باوجود ہمیشہ یہ صورت نہیں ہو پاتی کہ ملفوظی اور مکتوبی شکلوں میں مکمل مطابقت ہو۔ اگر اس پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے گا تو املا کی غلطیوں کا ایک اور دروازہ کھل جائے گا یعنی کسی نے ' قبلے نے' کو' قبلہ نے'' لکھ دیا تو اسے املا کی غلطی قرار دیا جائے گا' حالانکہ ایسی صورتیں بھی ہوسکتی ہیں جن میں یہ صحیح نہ ہو۔ اس کے علاوہ بعض الفاظ ایسی شکلوں میں بھی امالہ قبول کرتے ہیں جن کا شاید کوئی قاعدہ ہی نہیں ہے۔ اس لیے صحیح اور غلط کا دو ٹوک فیصلہ بڑا اگمرہ کن ہوسکتا ہے۔

نوراللغات میں امالہ کے تحت ۱۶ قاعدے درج کیے گئے ہیں لیکن اکثر قاعدوں میں ایسے مستثنیات ہیں کہ صحیح معنوں میں کوئی قاعدہ ہی نہیں رہتا۔ کہیں کہیں اختلاف رائے بھی نظر آتا ہے مثلاً شہروں کے ناموں میں:

''بعض حضرات کی رائے ہے کہ کلکتہ' آگرہ وغیرہ جس صورت

میں (ی) کی آواز سے بولیں اسی طرح لکھیں.............

---

[1] اردو املا' ص ۳۰۹' ۳۱۰

بعض کہتے ہیں اس صورت میں بوجہ علم ہونے کے امالہ جائز نہیں۔"[1]

امالے میں دراصل محض صوتی پہلو ہے جہاں الف اور ہائے مختفی پر ختم ہونے والا لفظ محرف صورت میں صاف طور پر اپنی اصلی حالت پر بولنے میں برا معلوم ہوتا ہے وہاں امالہ لازمی ہو جاتا ہے۔ الف میں یہ قباحت زیادہ نمایاں ہوتی ہے مثلاً 'لڑکا کی کتاب' لازمی طور پر 'لڑکے کی کتاب' بولا اور لکھا جائے گا۔ لیکن ہائے مختفی میں ہر جگہ یہ صورت نہیں ہوتی مثلاً مندرجہ ذیل مصرعوں کو اگر اسی طرح پڑھا جائے جس طرح یہ لکھے جا رہے ہیں تو کوئی خاص قباحت نہیں معلوم ہوتی:

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ

غازہ سے ہر چند چمکے رنگِ روئے مہ لقا (ذوقؔ)

ہو تک اے خامہ باریابِ حضور (سوداؔ)

آخری مصرع خود رشید حسن خاں کے مرتب کیے ہوئے انتخاب سوداؔ میں اسی طرح موجود ہے۔[2]

اس کے علاوہ کبھی کبھی محل استعمال ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ امالہ نہ محرف صورت میں درست ہو نہ منادا میں مثلاً:

(۱) "مرثیہ" کے لغوی معنی ہیں وصفِ میت۔

---

[1] نور اللغات، جلد اول، ص ۳۵۷ [2] انتخابِ سودا مرتبہ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۲ء، ص ۲۰۲

(۲) قبلہ نے ہی تو مجھے وہاں جانے سے منع کیا تھا۔

(۳) قبلہ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ میں وہاں نہ جاؤں۔

اب یہ مثال دیکھیے :

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ

حالانکہ یے دبتی ہے لیکن املے کے بغیر پڑھنا صحیح نہ مانا جائے گا۔

اس کے برعکس اس مصرع میں:

کعبہ اگر چہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ

کعبہ کی ہائے مختفی پورے الف کی طرح تلفظ میں آتی ہے لیکن اسے لکھا جائے گا ہائے مختفی ہی سے۔ ہائے مختفی اور الف کا قافیہ جائز ہونے کی وجہ سے قافیے میں تو اکثر ہائے مختفی کو الف سے بدل دیا جاتا ہے لیکن دوسرے تمام موقعوں پر یہ رعایت رکھی جائے تو ہم ایک عجیب صورتِ حال سے دوچار ہوں گے۔ ملفوضی حالت کو دیکھیے تو یہاں 'کعبہ' غلط ہے لیکن اگر 'کعبا' لکھ دیا جائے تو مکتوبی اعتبار سے املا غلط ہو جائے گا۔ چنانچہ اصول یہ نکلتا ہے کہ ملفوظی اور مکتوبی حالت میں اختلاف کو املا کی غلطیوں میں شمار نہ کرنا چاہیے۔

ضرورت شعری کی مثالوں سے خصوصاً جو قافیے سے تعلق رکھتی ہوں املا میں (اور صحت الفاظ اور صحت تلفظ میں بھی) استدلال زیادہ کارآمد نہیں ہوتا لیکن یہاں غالبؔ کا یہ مصرع غور طلب ہے:

ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

اگر ''تقاضا کا'' اتنا ہی غلط اور مکروہ ہوتا تو یہاں کیوں نظم کیا جاتا اور ہم اسے اس طرح کیوں پڑھتے۔

مقدمہ بازی کو مقدمے بازی' ذمہ داری کو ذمّے داری' کرایہ داری کو کرایے داری ' سودا بازی کو سودے بازی بولنے اور پڑھنے کا کیا جواز ہے جبکہ بعد میں کوئی حرف بھی نہ ہو مثلاً برسوں مقدمے بازی ہوتی رہی' ہماری ذمّے داری کیا ہے۔ اگر بعد میں کوئی حرف آئے مثلاً کرایہ داری میں بڑی مشکل ہے' سودے بازی کا یہ طریقہ مناسب نہیں۔۔تو قاعدے کے مطابق امالے کا اثر لفظ کے آخری حرف پر پڑتا ہے لیکن ان الفاظ میں پہلا ٹکڑا امالہ کیوں قبول کرتا ہے۔ چلن کے سوا کسی قاعدے کو رہبر نہیں بنایا جا سکتا۔ صحیح الفاظ مقدمہ بازی' ذمہ داری اور سودا بازی ہی ہیں۔ کیا اسی طرح تمام الفاظ بدلیں گے اور صحیح مانے جائیں گے؟ مثلاً پردے داری' نکتے آرائی' قاعدے دانی' عشوے سازی' اشارے بازی' ہرزے سرائی' رتبے شناسی' قصیدے گوئی' خاکے نگاری' ڈرامے نگاری' مرثیے نگاری۔ یا کہیں کوئی روک لگائی جائے گی؟ ایسے کچھ مرکبات کو جو معیاری بول چال اور تحریر میں امالہ قبول کر چکے ہیں مستثنیات میں شمار کیا جائے گا یا ان کی بنا پر عام قاعدہ بنا کر تمام مرکبات پر عائد کر دیا جائے گا؟

امالے کے عام قاعدے اور اردو میں جس حد تک اس کا چلن ہے اس سے مجھے اختلاف نہیں ہے۔ صوتی اعتبار سے جہاں امالہ بالکل لازمی ہے میں

اسی طرح لکھنے کے حق میں ہوں لیکن چند سامنے کی مثالوں کو مدّ نظر رکھ کر مجھے یہ کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ ہر جگہ امالے کے ساتھ لکھا جائے ورنہ املا غلط ہوگا۔ مذاق سلیم کی تو بات ہی اور ہے' جہاں خود قاعدے میں اختلاف ہے وہاں اور بھی احتیاط درکار ہے ایسے موقعوں پر بہتر یہ ہوگا کہ لفظ کے اصل املا کو برقرار رکھا جائے۔

چند مستثنیات سے قطع نظر کر کے ترکیبات عطفی میں بھی امالے کو عام کرنا نہ قرین صحت ہے اور نہ قرین مصلحت۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو ترکیبات اضافی میں امالے کو کس قاعدے سے روکا جائے گا؟ اردو کا قاعدہ یہی ہے کہ فارسی عطف واضافت میں امالہ نہیں ہوتا۔ ضرورتِ شعری کے نمونوں یا چند دوسری مثالوں پر قیاس کر کے اس کو توڑنے کی کوشش نہ کرنا چاہیے۔ امالے کا ایسا ہی شوق ہے تو بحث ومباحثے اور ترمیم واضافے استعمال کرنے کے بجائے ''بحث اور مباحثے'' اور ''ترمیم اور اضافے'' استعمال کیجیے۔ زبان کو کسی اصول یا معیار کا پابند نہ رکھنے سے کیا فائدہ؟

رشید حسن خاں صاحب نے ہائے مختفی اور الف پر ختم ہونے والے الفاظ کے ساتھ ایسے الفاظ کے امالے کا قاعدہ بھی نافذ کر دیا ہے جن کے آخر میں عین ہے۔ لکھتے ہیں:

'' برقع ، موقع ، مطلع ، مقطع ، مصرع ، موضع ، مجمع ، مقنع ،

مطبع یہ نو لفظ ہیں۔ جمع کی صورت میں نیز محرّف صورت میں ان کے آخر

میں یے کا اضافہ کیا جائے گا۔ جیسے مطلع میں 'مقطعے سے' موقعے پر'

چار مصرعے' دو برقعے۔''۱

جمع کی صورت میں تو ان الفاظ میں یے کا اضافہ بالکل ٹھیک ہے لیکن محرّف صورت میں قطعاً غلط ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہائے مختفی اور الف کے املے میں دونوں حروف یے سے بدلتے ہیں' ان پر یے کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔ عین پر یے کے اضافے کا نہ کوئی طریقہ ہے اور نہ جواز۔ اگر ایسا کوئی قاعدہ ہوتا کہ عین کو یے سے بدل دیا جائے گا تو پھر بھی غنیمت تھا لیکن ایسا کوئی قاعدہ نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ ان الفاظ کی محرّف صورت کا قاعدہ نوراللغات میں یوں درج ہے:

''وہ الفاظ جن کے آخر میں عین ہوتا ہے حرف ربط آنے سے بجائے (ی) کے حرف ماقبل عین کو کسرہ دے کر بولے جاتے ہیں جیسے مصرع میں سکتہ ہے۔ مطلع پر آفت آگئی۔ مقطع پر کیا منحصر ہے۔''۲

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی نے بھی لکھا ہے:

''جن کے آخر میں عین ہے ان کے ماقبل حرف ربط آنے سے بجائے (ی) کے کسرہ قبول کرتے ہیں۔ مجمع میں۔ مطلع کو۔ مقطع پر۔ ان کو (یے) سے لکھنا خطا ہے۔''۳

جناب رشید حسن خاں اس قاعدے سے بے خبر نہ تھے اردو املا

---

۱ اردو کیسے لکھیں' ص ۸۹

۲ نوراللغات' جلد اول' ص ۳۵۷

۳ زباں دانی از عشرت لکھنوی' ۱۹۳۰ء ص ۱۹

میں انھوں نے لکھا ہے:

''کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ مخرّف صورت میں اور جمع کی صورت میں عام قاعدے کے مطابق ان لفظوں کے آگے یے کا اضافہ نہیں کیا جائے گا بلکہ ع سے پہلے والے حرف کو زیر دینا کافی ہوگا۔''[1]

اس اقتباس میں '' کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے'' سے غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ یہ رائے شاید کچھ نا قابلِ ذکر لوگوں کی ہے لیکن دراصل یہ رائے اکثر قابل ذکر لوگوں کی ہے۔ خود رشید حسن خاں نے بحر البیان (بحر لکھنوی) اور مفید الشعرا (جلال لکھنوی) کے اقتباسات درج کیے ہیں۔ عین پر یے کے اضافے کے حق میں صرف ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے ایک خط کا اقتباس پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد رشید حسن خاں صاحب فوراً یہ فیصلہ کر دیتے ہیں کہ جمع کی طرح مخرّف صورت میں بھی عین کے بعد یے لکھنا چاہیے۔ وہ اسے آسان اور سادہ صورت قرار دیتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ

''یہ طریقہ اردو کے عام قاعدے سے مطابقت بھی رکھتا ہے۔''[2]

معلوم نہیں آسانی اور سادگی کا یہاں کیا مفہوم ہے اور وہ کون سا عام قاعدہ ہے جس سے یہ طریقہ مطابقت رکھتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے عام قاعدہ یہ ہے کہ ہائے مختفی اور الف مخرّف صورت میں یے سے بدل

---

[1] اردو املا، ص ۴۴۱ [2] اردو املا، ص ۴۴۳

جاتے ہیں۔ان پر کسی نئے حرف کا اضافہ نہیں کیا جاتا۔

جن الفاظ کے آخر میں عین ہے ان کے املے کے مستحسن قاعدے کی روشنی میں اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ جن الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی ہے ان کا املا بھی محرّف صورت میں یے سے نہ بدلا جائے بلکہ تلفظ میں حرف ماقبل پر زیر قیاس کیا جائے' اور ضرورت ہو تو حرف ماقبل پر زیر لگا دیا جائے مثلاً کعبہِ میں ' قبلہِ کو ' غازہِ سے ' خامہِ نے یا یہ مصرعے :

یوں نقل ہے خامہِ کی زبانی

پردِہ کو تعیّن کے درِدل سے اٹھادے

کریں گے کوہکن کے حوصلہِ کا امتحاں آخر

شہیدائے ذوق سینہِ میں ہوئی ہیں حسرتیں لاکھوں

زندگی قطرہِ کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات

یہ طریقہ واقعی بہت آسان ہوگا کیونکہ الفاظ اپنی اصلی صورت میں برقرار رہیں گے اور محرّف حالت کی وجہ سے ان کے املا کی دو شکلیں نہ ہوں گی۔

''املے کی ایک صورت'' کے تحت جناب رشید حسن خاں نے لکھا ہے:

''عربی کے باب افعال کے جو مصدر اردو میں مستعمل ہیں اور جن کے آخر میں الف بھی ہے (اردو کے لحاظ سے)............ان میں امالہ نہیں ہوتا یعنی الف 'یے' سے نہیں بدلتا۔ان میں خاص

طور پر ایک قابل ذکر لفظ ہے املا۔۔اس کو غلطی سے کچھ لوگ 'املے'
لکھ دیا کرتے ہیں' جیسے: املے کی غلطی'۔ یہ ٹھیک نہیں۔ املا ہو یا انشا؛
دونوں لفظ اسی طرح رہیں گے۔ جس طرح 'انشے کی کاپی نہیں لکھا
جائے گا' اسی طرح 'املے کی کاپی' نہیں لکھا جائے گا۔۔۔۔۔۔۔۔'' [۱]

اس تحریر میں ایک مسلمہ قاعدے کے طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ املا کا
امالہ نہیں ہوتا لیکن یہ صحیح نہیں۔ نوراللغات میں اس قاعدے کے بیان میں ''املا''
کو مستثنا قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

''عربی کے وہ مصادر جو ہمزہ پر ختم ہوتے ہیں یا جن مصادر میں
الف کے بعد اصل میں ہمزہ ہوتی ہے اور بروزن افعال' افتعال
استفعال ہوتے ہیں اردو ترکیب میں یائے مجہول سے نہیں بولے
جاتے ہیں جیسے منشاء' مبداء' اخفاء' اجرا' ارتضا' اصطفا' ابتدا' انتہا'
استہزا' استقرا۔ اس قاعدے سے املا مستثنا ہے۔'' [۲]

''انشے کی کاپی'' لکھنا غلط سہی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ املے کی کاپی بھی غلط
ہے۔ صاحب نوراللغات نے تو اصل لغت میں املا کے سلسلے میں وضاحت ضروری
خیال کی تھی وہ بھلا دیباچے میں کیوں نہ لکھتے کہ

''املے کی صحت کا پورا لحاظ کیا ہے مثلاً بوالہوس' بخل وغیرہ۔'' [۳]

دوسرے مستند حضرات نے بھی املا کا امالہ کیا ہے مثلاً اثر لکھنوی لکھتے ہیں:

''خدا معلوم املے کے لحاظ سے حضرت مؤلف نے توتی کو طوطی پر کیوں

---

[۱] اردو املا' ص ۴۴۳ [۲] نوراللغات' جلد اوّل' ص ۳۵۷ [۳] نوراللغات' جلد اوّل' دیباچہ' ص ۱۴

ترجیح دی ہے۔[1]

پروفیسر سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ کے ایک خطبے میں بھی دو جگہ یہ صورت ملتی ہے:

''ممتحنین امتحانوں کی کاپیوں میں ان قواعد کی خلاف ورزی کو اسی طرح غلطیوں میں شمار کریں جس طرح املے کی دوسری غلطیوں کو غلطی قرار دیتے ہیں۔''

.....

''وہ لفظ جو تلفظ میں یکساں اور معنوں میں مختلف ہیں جب لکھ دیے جاتے ہیں تو املے کے اختلاف سے اپنے معنی خود بتا دیتے ہیں''[2]

ان شواہد کی موجودگی میں مذکورہ استثنا سے اختلاف کیا جا سکتا تھا یا اسے مختلف فیہ قرار دیا جا سکتا تھا اور اپنی رائے لکھی جا سکتی تھی، لیکن جناب رشید حسن خاں نے جا بجا نہ قاعدوں کے بیان میں احتیاط سے کام لیا ہے اور نہ چلن کی صحیح طور پر نمائندگی کی ہے۔

---

[1] فرہنگِ اثر، ص ۳۵ [2] اردو زبان اور اس کا رسم خط، ص ۶۵، ۴۶

الفاظ کو الگ اور ملا کر لکھنا

الفاظ کو الگ الگ لکھنے کی جو روش انجمن ترقی اردو ہند کی اصلاحات کے مطابق اردو املا میں داخل ہو گئی ہے اس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

اردو میں الفاظ کو ملا کر لکھنے کی روش میں بڑی بے قاعدگیاں تھیں۔ ان کو دور کرنا ضروری تھا لیکن انجمن کی رسمِ خط کمیٹی (۱۹۴۴ء) دوسری انتہا پر چلی گئی۔ حالانکہ کو حال آں کہ 'مصیبت کو مصی بت اور لکھتے کو لکھ تے وغیرہ لکھنے کی سفارشات کی گئیں اور ان کو انجمن کی مطبوعات کے ذریعے سے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا۔ لیکن اس کے اثرات میں نے ایک عجیب وغریب شکل میں بعض لوگوں کی تحریروں میں دیکھے ہیں۔ وسط ہند اور جنوبی ہند میں اب بھی یہ انداز تحریر غالباً مفقود نہیں ہے۔ اس کے مطابق ایک ہی شخص کی تحریر میں ایک طرف چلتے اور سنبھلتے جیسے الفاظ تو چل تے اور سنبھل تے لکھے ہوئے ملتے ہیں اور دوسری طرف آپ کو' کے لیے اور کس واسطے کو آ پکو' کیلیے اور کسواسطے لکھا جاتا ہے۔ گویا جن لوگوں نے انجمن کی اصلاحات کے زیر اثر اردو لکھنا سیکھا یا اختیار کیا انھوں نے یہ سمجھا کہ مصادر اور ان کے صیغوں کو تو

ٹکڑے ٹکڑے کر کے لکھا جائے لیکن دو الگ الگ لفظوں کو ملا کر ہی لکھا جائے۔ اس طرح الفاظ کو توڑ کر لکھنے اور ملا کر لکھنے کے نمونے ایک ہی تحریر میں جمع ہو گئے اور اصلاح کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔ یہ ایک غیر معمولی کیفیت تھی اور اب تقریباً ختم ہو چکی ہے لیکن اس سے پتا چلتا ہے کہ سفارشات سے ان کے نفاذ تک کچھ غیر متوقع مرحلے بھی آ جاتے ہیں اور جب املا کی اصلاح کا گجر بجتا ہے تو لوگوں کی اپنی فہم و فراست بھی نئے نئے گل کھلا دیتی ہے۔

دو مفرد الفاظ کو الگ الگ لکھنا بالکل صحیح ہے اور اس طریقے کو جاری رہنا چاہیے مثلاً آپ کا' اس کا' ان کی' مجھ کو' اس لیے' لکھوں گا' جائیں گے' وغیرہ' بلکہ اس اصلاح کو کامیابی سے رائج کرنے کے لیے ہمیں انجمن کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ہندی میں اب تک اس کی طرف دھیان نہیں ہے اور دو مفرد الفاظ بکثرت ملا ملا کر لکھے جاتے ہیں۔ تاہم جو مرکبات مفرد الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن انجمن کی اصلاح کے زیر اثر الگ الگ لکھے جانے لگے ہیں ان کو دوبارہ ملا کر لکھنے کی طرف توجہ دینا چاہیے۔ چونکہ، کیونکہ، کیونکر، چنانچہ، بلکہ، جبکہ، حالانکہ ایسے کچھ خاص الفاظ ہیں۔ ان کے الگ الگ لکھنے سے تلفظ میں جو سکتہ پڑتا ہے وہ صحیح تلفظ کے مطابق نہیں ہوتا خصوصاً بلکہ کو بل کہ لکھنے سے یہ عیب بہت نمایاں ہو جاتا ہے یعنی بلْ۔ کہ۔ بالکل ایسے تو نہیں لیکن ان سے ملتے جلتے کچھ دوسرے الفاظ بھی ہیں مثلاً بہر حال، بخوبی، جا بجا، بقول، بدستور، بخدا، ہو بہو وغیرہ۔

ایسے دوسرے مرکبات کے لکھنے میں جو ایک کلمے کا حکم رکھتے ہیں آسانی اور دیدہ زیبی کا لحاظ رکھنا چاہیے اور اس کا بھی کہ دوسرے الفاظ سے اشتباہ یا التباس نہ ہو۔ اسی طرح دوسرے مرکبات کے اجزا کو بھی خواہ مخواہ منفصل نہ کرنا چاہیے۔ الفاظ یا مرکبات کو بلا وجہ الگ الگ ٹکڑوں میں لکھنے کا طریقہ شاید کسی زبان میں نہیں ہے۔ اردو کی لکھائی' آسانی ' دیدہ زیبی اور وضاحت جہاں تک اجازت دے مرکبات کو ملا کر لکھنا چاہیے اور اس قاعدے کا اطلاق دوسری زبانوں کے الفاظ و مرکبات پر بھی کرنا چاہیے مثلاً

باغبان، بخیر، بذات خود، براہِ کرم، بصد ادب ، بقید حیات، بہر صورت، بیتاب، بیدل، بیشتر، بیکراں ، پاندان ، پیشتر، جہانبانی ، دُلدل ، دسترس، دم بخود ،خاصدان، خوبصورت،خوشبو، خوفناک، سخنور، شاہجہاں، شاہراہ، شاہکار ، شہتوت، شہزادہ، غمکدہ، فیلبان، قلمدان ، کاریگر، کاشتکار، کلجگ ، کمزور، کنمناہٹ ، گلدان، گنہگار ، نامور، نگہبان، نمکدان ، ہمدم ، ہمعصر ، ہموطن ، یکرنگی ،یکساں ، یکسانیت، یکسر ، یکقلم۔

پارلیمنٹ ، سیمینار، کانفرنس، گراہم بیلی،
گلکرسٹ ، یونیورسٹی۔

ایسے الفاظ اور مرکبات بہت ہیں جن کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔اسی طرح وہ الفاظ و مرکبات بھی بکثرت ہیں جو ملا کر لکھنے میں اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ تمام الفاظ و مرکبات کو لکھنے کے لیے اصول سازی میں کسی سہولت کے پیشِ نظر ایک قاعدہ یا چند قاعدے کام نہیں دے سکتے۔ایک ایک مرکب کو دیکھنا پڑے گا اور تحریر کے لیے اس کی شکل متعین کرنا پڑے گی۔ یہ کام مشکل ہے لیکن اس کے بغیر یہ مرحلہ طے نہیں ہوسکتا۔قاعدوں کے مطابق املا مقرر کرنے سے بہت سے الفاظ اور مرکبات کی ایسی شکلیں ابھرنے لگتی ہیں جن سے اردو پڑھنے لکھنے والے نا آشنا ہیں اور آسانی سے مانوس نہیں ہو سکتے۔

اردو املا کا یہ عجیب المیہ ہے کہ جو اس کی نمایاں خصوصیات ہیں وہی اس کی دشواریوں کا باعث تصور کی جاتی ہیں ۔ دو الگ الگ لفظوں کو ملا کر لکھنے کا طریقہ غلط تھا۔اس کی اصلاح بھی بڑی حد تک ہو گئی ہے۔ زیادہ بڑے الفاظ جو لکھنے میں بدنما' گنجلک اور مشکل معلوم ہوتے ہیں ان کے ٹکڑے بھی کیے جا سکتے ہیں۔لیکن اس سے حرفوں کو ملانے کا طریقہ ختم نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ اردو املا بلکہ رسم خط کا ایک لازمی عنصر ہے۔مختصر الفاظ میں بھی حروف کو ملا کر لکھنا اور ان کی بدلتی ہوئی شکلوں کو پہچاننا پڑے گا۔لیکن کچھ حضرات اردو رسمِ خط کی اس معمولی سی

دشواری کو عجب عجب طرح سے اجاگر کرتے ہیں مثلاً سر رضا علی نے پبلک سروس کمیشن کے تحت انڈین سول سروس کے انٹرویو میں یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ اردو کا ایک شعر جس میں کئی الفاظ جو الگ الگ لکھے جاتے ہیں ملا کر لکھ دیے تھے، امیدواروں سے پڑھوائے تھے۔ آفریں ہے ان امیدواروں پر جن میں سے ایک تہائی نے سر رضا علی کے بیان کے مطابق شعر پڑھ لیا۔ ایک تہائی نے کئی منٹ میں کچھ غلطیوں کے ساتھ شعر پڑھا، اور ایک تہائی شعر کو بالکل نہ پڑھ سکے۔[1] یہ مثال اردو املا کی روش کے خلاف کئی الفاظ کو ملا کر لکھ دینے کی تھی لیکن سر رضا علی نے اپنی دانست میں اردو میں حروف کو ملا کر لکھنے کی بے پناہ دشواری ثابت کردی۔ اسی طرح کچھ اور حضرات جب علمی معلومات اور دلیلوں سے کام نہیں چلا پاتے تو زبانی امتحانات کے امیدواروں اور طالب علموں وغیرہ کے ساتھ اپنے دلچسپ تجربات بیان کر کے اردو رسم خط کی دقتوں کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ جناب رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

> ''حرفوں کو ملا کر لکھنا اردو کی اہم خصوصیت ہے مگر اس خصوصیت کو وبال جان نہیں بننا چاہیے۔''[2]

لیکن اس کے برعکس حرفوں کو الگ الگ لکھنا بھی وبال جان نہ بننا چاہیے۔ جہاں

---

[1] دیکھیے اردو میں لسانیاتی تحقیق مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی ص ۴۱۳، ۴۱۴ [2] اردو املا، ص ۴۷۸

تک الفاظ کا تعلق ہے انگریزی اور ہندی میں کوئی لفظ خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو الگ الگ ٹکڑوں میں نہیں لکھا جاتا۔ اردو میں رسم خط کے بعض پہلوؤں کے پیش نظر ایسا کیا جا سکتا ہے لیکن جس طرح تمام الفاظ کو ملا کر لکھنا ٹھیک نہیں اسی طرح تمام الفاظ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا بھی مناسب نہیں۔ دونوں طریقوں میں توازن ضروری ہے۔

چند متفرق باتیں

(۱) قافیہ اور املا

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے ''مختفی ہ یا الف؟'' کی بحث میں یہ ہدایت کی تھی کہ

''جب قافیے میں مختفی ہ الف کے مقابل ہو تو اس مختفی ہ کو لکھنے میں الف سے بدل دینا چاہیے۔ جیسے:

تغافلہائے بے جا کا گلا کیا۔''[۱]

املا نامہ میں (ی) اور الف کے سلسلے میں یہی سفارش کی گئی ہے مثلاً پیدا اور وا کے قافیوں میں غالبؔ کا مصرع یوں لکھنے کے لیے کہا گیا ہے:

کب تک خیالِ طرۂ لیلا کرے کوئی

اور لکھا ہے کہ

''ان موقعوں پر اصول یہ ہونا چاہیے کہ قافیے کی ضرورتوں کی پابندی کی جائے۔''[۲]

لیکن اس قسم کی تجویزوں سے املا کا کوئی خاص تعلق نہیں۔ ہائے مختفی اور الف اور اسی

---

[۱] اردو املا' مشمولہ اردو میں لسانیاتی تحقیق' ص ۶۱ [۲] املا نامہ' ص ۳۳

طرح (یٰ) اور الف کا قافیہ جائز ہے' املا میں مطابقت کی جائے یا نہ کی جائے۔ عموماً مطابقت کے ساتھ لکھا بھی جاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہیے کہ ہر جگہ قافیے کی ضرورتوں کی پابندی میں املا بدلا جا سکتا ہے مثلاً امیرؔ مینائی کی ایک غزل کا مطلع ہے:

دل مرا کشتہ ہے یارب کس شہادت گاہ کا
ہر شگافِ زخم دروازہ ہے بیت اللہ کا

اسی طرح راہ اور ماہ کے قافیوں میں ان کی ایک اور غزل میں یہ شعر ہے:

رکھتا نہیں ہے فرق سرمو مرا سخن
گویا زبانِ خامۂ صنعِ الہٰ ہوں

ان قافیوں میں قافیے کی ضرورت کے لحاظ سے املا میں ترمیم کی ہی نہیں جا سکتی جب تک کہ آپ بیت اللہ کو "بیت ا للاہ" اور صنع الہٰ کو "صنع الاہ" لکھنے کے درپے نہ ہوں۔ لیکن شادؔ عظیم آبادی کی اس غزل میں اس کی بھی گنجائش نہ ہوگی:

ہے ہے مری چشمِ حیرت کا سب دردِ دل ان سے کہہ جانا
دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنے کچھ سوچ کے ان کا رہ جانا

ظاہر ہے کہ اصول ناقص ہوا اور اصول بناتے وقت اس طرح کی مثالیں سامنے نہ تھیں جو ہونا چاہیے تھیں۔

(۲) اعدادِ استغراقی:

گیارہ سے اٹھارہ تک اعداد معیّن کے تلفظ اور املا میں اب کوئی اختلاف نہیں۔ ان کے اعداد ترتیبی میں اٹھارھواں اور اٹھارواں دونوں چل سکتے ہیں۔ اعداد استغراقی گیارہوں، بارہوں، تیرہوں وغیرہ ملتے ہیں۔ لیکن جناب رشید حسن خاں نے لکھا ہے:

''مگر اب استعمال عام میں یہ اعداد استغراقی بھی بہ ہائے مخلوط آتے ہیں؛ بول چال میں بھی اور تحریر میں بھی؛ اس لیے اب ان اعداد کو بہ ہائے مخلوط مرجّح قرار دیا جائے گا۔ اس طرح:

گیارھوں، بارھوں، تیرھوں، چودھوں، پندرھوں، سولھوں، سترّھوں، اٹھاروں۔''[۱]

ان میں اٹھآروں تو اسی طرح صحیح مانا جا سکتا ہے جس طرح اٹھارواں ہے لیکن دیگر اعداد استغراقی کا املا ہائے مخلوط کے ساتھ درست نہیں معلوم ہوتا۔ ہائے مخلوط کے ساتھ ان کا تلفظ کچھ عجیب سا ہے۔ ان کی صحیح شکل ہائے ملفوظ کے ساتھ گیارہوں، بارہوں، تیرہوں، چودہوں، پندرہوں، سولہوں، سترہوں، اٹھارہوں تسلیم کرنا چاہیے۔

(۳) الہٰ

املا نامہ میں لکھا ہے کہ الہٰ کا رائج املا الٰہ ہے[۲] جو صحیح نہیں۔ فرہنگ

---

[۱] اردو املا، ص ۳۴۸ [۲] املا نامہ، ص ۳۴

آصفیہ میں دوسرے اندراجات میں اور نور اللغات میں اصل لغات میں الہٰ ہی ملتا ہے۔ لفظ کے آخر میں ہائے ملفوظ متصل پر شوشہ کب کا متروک ہو چکا ہے۔ پہلے بھی کہیں کہیں لگا دیا جاتا تھا۔ اردو میں اسے دوبارہ داخل کرنا غیر ضروری ہے۔

(۴) اونچائی

اردو املا اور املا نامہ میں ''اونچائی'' میں واؤ کو غیر ضروری قرار دیا گیا ہے۔[۱] لیکن اونچائی بھی ایک لفظ ہے۔ جس طرح اونچ نیچ اور اونچا میں واؤ ضروری ہے اسی طرح اونچائی میں بھی واؤ چاہیے۔ رشید حسن خاں نے لکھا ہے کہ فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات دونوں میں ''انچائی'' بغیر واؤ کے ہے۔[۲] یہ ٹھیک نہیں۔ نور اللغات میں اصل لغات میں نہ انچائی ہے نہ اونچائی لیکن ''اونچی چوٹی'' کے معنی میں ہے کہ ''بغیر مانگ نکالے سر کے بال تین حصے کر کے پشتِ سر کی انتہائی اونچائی سے گوندھے جاتے ہیں۔''[۳] اور ''بلندی'' کے معنی میں اُنچائی دیا ہے۔[۴] فرہنگ آصفیہ میں اصل لغات میں ''انچائی'' ہے[۵] لیکن ''بلندی'' کے معنی میں ''اونچائی'' درج ہے۔[۶] تعجب ہے کہ رشید حسن خاں صاحب ماخذ کی پوری کیفیت پیش نظر نہیں رکھتے اور غلط بیانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

---

۱ اردو املا، ص ۲۵۵ اور املا نامہ، ص ۵۲ ۲ اردو املا، ص ۲۵۵

۳ نور اللغات، جلد اول، ص ۴۰۱ ۴ نور اللغات، جلد اول، ص ۶۲۲

۵ فرہنگ آصفیہ، جلد اول، ص ۲۴۴ ۶ فرہنگ آصفیہ، جلد اول، ص ۴۱۰

(۵) چھ

املا نامہ اور اردو املا میں چھ کو چھے لکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جناب رشید حسن خاں لکھتے ہیں:

''اس لفظ کا املا ایک زمانے میں 'چھہ' تھا مگر اس کو اکثر لوگ 'چھے' لکھا کرتے تھے اور یہ لکھاوٹ اب بھی دیکھنے میں آتی رہتی ہے؛ جب کہ 'چھ' کوئی لفظ ہی نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ جب تک کوئی اور حرف شامل نہ کیا جائے' اس وقت تک یہ کسی حرکت کو قبول کر ہی نہیں سکتا۔ جیسے: پوچھا ایک لفظ ہے' اس کا جزوِ آخر 'چھ' ہے' جزوِ لفظ کی حیثیت سے تو یہ آسکتا ہے' ایک لفظ کی حیثیت سے کیسے آسکتا ہے؟''[۱]

چھ کو چھے لکھنے کی تجویز دراصل ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی ہے جو انھوں نے تلفظ میں مطابقت کی وجہ سے کی تھی لیکن رشید حسن خاں صاحب نے نئی منطق نکالی کہ ''چھ'' کوئی لفظ ہی نہیں ہوسکتا۔ ماہرین لسانیات جو کچھ بھی کہیں لیکن دوچشمی ہے اردو حروف تہجی میں ایک جداگانہ حرف ہے۔ دو حرفوں سے مل کر ایک لفظ کے بننے میں کوئی قباحت نہیں۔ چ' ھ زیر چھ ہوگیا۔ پوچھ میں چ اور دوچشمی ہے موقوف ہیں۔ جس طرح دوست میں س اور ت موقوف ہیں۔ خود ان کے بیان کے مطابق سرمایۂ زبان اردو میں چھ ہے اور فرہنگ آصفیہ اور نوراللغات دونوں میں چھ۔ بات ختم ہوجانا چاہیے تھی۔ پہلے اس عدد کا املا چھہ تھا لیکن بعد کو چھ متعین ہوگیا اور یہی رائج ہے۔ اب ترمیم سے کیا مقصود ہے؟ تلفظ وہی رہتا ہے جو چھے کا

---

[۱] اردو املا' ص ۴۵۷

ہے۔ اگر کوئی اس کو ایک حرف مانتا ہے تو اس صورت میں بھی ایک نئے املا کا اضافہ غیر ضروری ہے۔ ہندی میں کلمۂ نفی 'نہ' کے لیے صرف ایک حرف ''نا'' لکھا جاتا ہے۔

(۶) خوراک

املا نامہ اور اردو املا میں ''خوراک'' کو واؤ معدولہ والے الفاظ کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔[۱] نور اللغات کے مطابق یہ تلفظ فصیح تھا۔[۲] لیکن اب ایسا نہیں ہے۔ اب معیاری اور صحیح تلفظ خوراک ہی ہے۔ مولانا حالی کی مثنوی ''تعصب و انصاف'' کا ایک شعر ہے:

ہے بَری عیب سے خوراک اپنی پاک دھبّے سے ہے پوشاک اپنی

جوشؔ ملیح آبادی نے بھی اپنی نظم ''بغاوت'' میں یوں ہی نظم کیا ہے:

موت ہے خوراک میری موت پر جیتی ہوں میں
سیر ہو کر گوشت کھاتی ہوں لہو پیتی ہوں میں

(۷) دعوائے پارسائی' لیلائے شب

املا نامہ میں لکھا ہے:

''اضافت کی صورت میں بھی ان لفظوں کو الف سے لکھا جانا چاہیے' جیسے:

---

[۱] املا نامہ' ص ۵۴ اور اردو املا' ص ۲۶۹ [۲] نور اللغات' جلد دوم' ص ۵۰۶

دعوائے پارسائی لیلائے شب فتوائے جہاں داری[۱]

اضافت کی صورت میں یائے مجہول کا اضافہ کر کے ان لفظوں کو کسی اور طرح نہ لکھا جاتا ہے اور نہ لکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرح اضافت دعویٰ پارسائی اور لیلیٰ شب لکھی جائے گی۔

(۸) مشتقات

املا نامہ میں ایک جگہ اور اردو املا میں ہر جگہ مشتقات کے ق کو مشدّد لکھا گیا ہے۔[۲] تکرار سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی نہیں ہے۔ مشتق کے ق پر تشدید اردو میں پہلے ہی حذف ہو چکی ہے۔ جمع میں تشدید بولنے یا لکھنے کا سوال ہی نہیں ہے۔

(۹) آسائش، آئندہ، یہ

املا نامہ میں کئی جگہ مروجہ املا اور ترمیم شدہ املا دونوں کی اجازت دی گئی ہے۔ بعض صورتوں میں اس کے سوا چارہ بھی نہیں۔ لیکن آسائش، آئندہ اور یہ جیسے الفاظ میں صرف رشید حسن خاں کی رائے کی وجہ سے دوسری شکلوں کو املا میں جگہ دے دی گئی ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔ ان الفاظ کا صرف وہی املا قابل قبول ہونا چاہیے جو تلفظ اور رواج کے مطابق ہے۔

---

[۱] املا نامہ ص ۳۲ [۲] املا نامہ ص ۶۲/ اردو املا ص ۱۵۲، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷ وغیرہ۔

(۱۰) کتابت وطباعت

اردو املا میں کچھ انتشار کتابت وطباعت کے ان وسائل سے وابستہ ہے جو اردو کو میسر ہیں۔ کاتب بہت کم اپنی عادت کے خلاف کوئی کتاب لکھ کر دیتے ہیں۔ کوئی ایسی کتاب جس میں صحت املا، صحت زبان، حواشی اور رموز اوقاف کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہو ان کے لیے لکھنا آسان نہیں سطر میں جگہ کم پڑ جانے کی صورت میں لفظ کے اوپر لفظ لکھنے، دو لفظوں کو ملا دینے اور یائے مجہول کو نصف لکھنے کی مجبوریاں عام ہیں۔ کتابت کی غلطیوں کی پوری تصحیح نہیں ہو پاتی۔ کاتب سے لے کر مصحح اور مصلحِ سنگ تک بعض اوقات مصنف کی تحریر کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں وہ کسی دوسری طرح چھپ جاتی ہے۔ مصنف اپنی غلطی پر اتنا نہیں کڑھتا کیونکہ اس کا ذمے دار وہ خود ہوتا ہے لیکن دوسروں کے اس رویے پر سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں غالبؔ کو جو شکایت تھی آج کے مصنف کو بھی کسی نہ کسی شکل میں وہی شکایت ہے۔ اس کا تدارک ایک حد تک یوں ہوسکتا ہے کہ کتاب کا مسودہ اسی طرح صاف اور خوشخط تیار کر کے دیا جائے جس طرح کتابت مقصود ہو۔ جناب رشید حسن خاں نے اس سلسلے میں قاضی عبدالودود صاحب کا ذکر کیا ہے۔ ان کی مطبوعہ تحریروں میں غلط ناموں کے غلط نامے میں نے دیکھے ہیں۔ قاضی صاحب بہت بڑے محقق ہیں۔ میں صرف گزارشِ احوال واقعی کے طور پر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں خود یہ کرتا رہا ہوں اور اس سے کافی فائدہ ہوتا ہے،

لیکن پوری کامیابی نہیں ہوتی ۔ میں نے اپنے مضمون ناسخ معتقدِ میر میں اس کی بڑی کوشش کی کہ ناسخ کا یہ شعر جس کا پہلا مصرع غلط مشہور ہے صحیح طور پر شائع ہو:

زندگی زندہ دلی کا ہے نام مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

نگار (لکھنؤ) جیسے پرچے میں پہلا مصرع اسی طرح چھپ کر آیا جس طرح مشہور ہے یعنی

زندگی زندہ دلی کا نام ہے

اس مضمون کو ''تنقید و تجزیہ'' میں شامل کرتے وقت بھی اس کی طرف میری توجہ رہی. مسوّدے میں صحیح لکھ کر دیا لیکن کتابت میں پھر غلط لکھا گیا۔ کاپیوں کی تصحیح میں نے خود کی لیکن کتاب چھپ کر آئی تو مصرع بدستور غلط تھا۔ حالانکہ مشہور متن نہ صرف اصل کے خلاف ہے بلکہ بحر بھی بدل جاتی ہے لیکن کسی نے صحیح متن کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا بلکہ اپنی دانست میں بڑا احسان کیا کہ مجھے اتنی فاحش غلطی سے بچا لیا۔ مجبوراً غلط نامے میں اس کو شامل کیا گیا لیکن اسے کون دیکھتا ہے۔ کتابوں کو صحیح چھپوانے کی پوری کوشش کے باوجود بہت سی دوسری غلطیاں بھی میری کتابوں میں موجود ہیں۔ جن کو دیکھنے کے بعد کبھی کبھی تو مجھے اتنی مایوسی ہوئی ہے کہ کتاب کا شائع کرانا ہی بے سود معلوم ہوا ہے۔ رسائل میں بھی بہت کم کوئی مضمون پوری طرح صحیح چھپ کر آیا ہوگا۔

کتاب کے صحیح چھپنے کے لیے مصنف کی محنت و کاوش ضروری ہے لیکن یہ مجبوری کا سودا ہے اس سے یہ قاعدہ نہیں بن سکتا کہ کسی مصنف کو مسودات کی

تیاری یا مواد کی فراہمی وغیرہ میں معاوضے پر یا بغیر معاوضے کے لیکن بلا جبر واکراہ کسی دوسرے سے کوئی مدد لینے کا حق نہیں ہے اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس پر سہل انگاری اور بد دیانتی کا الزام لگایا جا سکتا ہے یا اس کے کام کو محض ان وجوہ سے حقارت کی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں مصنفین کو ریسرچ اسسٹنٹ اور ٹائپسٹ بلکہ اسٹینو گرافر تک کی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ہمارے مصنف کی یہ کم نصیبی ہے کہ وہ عام طور پر خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ کا مصداق ہے۔ لیکن کم نصیبی کو معیار بنانا ٹھیک نہیں۔ دراصل طباعت کے نظام کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ پیشہ ورانہ اور تجارتی مقاصد کے ساتھ ساتھ جب تک کتابوں کو صحیح چھاپنے اور چھپوانے کی لگن اردو کے مطبعوں اور ناشروں میں پیدا نہ ہوگی ان دشواریوں پر قابو پانا محال ہے۔ اس کے علاوہ ایک چیز ہے طباعت کی غلطی جو ہو کر رہتی ہے۔ اس سے کسی زبان کی چھپائی محفوظ نہیں رہتی۔ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں میں اگر غلطیاں نہیں ہوتیں یا بہت کم ہوتی ہیں تو اس کا سبب یہ نہیں کہ مصنف خود محنت کرتا ہے بلکہ پروف ریڈنگ کا معقول انتظام ہوتا ہے اور کتاب کو صحیح چھاپنے کی ذمے داری پریس اور ناشر کی ہوتی ہے۔

جناب رشید حسن خاں نے مسودات کی تیاری اور کتابت کی غلطیوں کی تصحیح میں پوری کدوکاوش کی ہوگی۔ ان کے ناشرین نے کتابت اور طباعت میں مصارف کے اعتبار سے بھی کوئی بخل نہ کیا ہوگا۔ لیکن غلطیاں ان کی کتابوں میں بھی

ہیں ۔ مثلاً اردو املا میں ان کے اختیار کیے ہوئے املا کے خلاف ''قصائی باڑا'' اور ''بوالعجبیاں'' لکھا ہوا ہے۔[۱] اسی طرح املا نامہ مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ میں ''موسیٰ عمراں' عیسیٰ دوراں'' اور فحوائے عبارت کے خلاف ''اکھاڑہ'' چھپا ہوا ہے۔[۲] لیکن ان غلطیوں کو مصنف یا مرتب کی سہل انگاری پر محمول کرنا زیادتی ہوگی۔

---

[۱] دیکھیے اردو املا' ص ۹۱' ۲۴۴ [۲] املا نامہ' ص ۳۳' ۵۵

رموزِ اوقاف اور علامات

رموز اوقاف اور علامات کا استعمال ضروری ہے۔ لیکن اس میں غلو سے کام نہ لینا چاہیے۔ اعراب کا استعمال صرف ایسے موقعوں پر کرنا چاہیے جہاں صحیح تلفظ کی نشاندہی کسی وجہ سے لازمی ہو۔

وقفے (؛)' رابطے (:) اور قوسین میں مجھلے اور بڑے بریکٹ کا استعمال اب انگریزی میں بھی کم ہو گیا ہے۔ برج موہن دتاتریہ کیفی نے ۱۹۴۱ء میں لکھا تھا:

> ''کولن کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اسی طرح سیمی کولن بھی غیر ضروری ہے کیونکہ انگریزی میں جہاں سے یہ علامتیں لی گئی ہیں ان کا صحیح اور بجا استعمال کرنے والے انگریز بھی سو میں سے پانچ سات ہی ہوتے ہیں۔''[1]

عبارت میں جب تک کہیں پہلے سے چھوٹا بریکٹ نہ ہو منجھلا بریکٹ نہیں آتا اور اسی طرح جب تک چھوٹا اور منجھلا بریکٹ نہ آیا ہو بڑا بریکٹ نہیں آتا۔

رابطے کا استعمال ایسے موقعوں پر ضرور کیا جاتا ہے جب دوسرے کا قول یا اقتباس

---

[1] کیفیہ' ص ۳۴۸

درج کیا جاتا ہے ۔ یہ قول یا اقتباس دہرے واوین میں لکھا جاتا ہے۔ جب دہرے واوین میں لکھی جانے والی عبارت میں اصل ماخذ کے مطابق کہیں دہرے واوین پہلے سے موجود ہوں تو ایسے حصوں یا لفظوں کو اکہرے واوین میں لکھنا چاہیے ۔ایک لفظ یا فقرے کے بعد دوسرے لفظ یا فقرے کو واوین میں لکھنا جبکہ دونوں کے درمیان سکتے کے لانے کا تقاضا بھی ہو قباحت سے خالی نہیں ۔اگر ایسے الفاظ یا فقرے دوسرے کے نہ ہوں تو واوین کے استعمال کے بجائے ان پر خط کھینچ دینا بہتر ہوگا۔

سکتے (؍) کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے خصوصاً نثر میں لیکن یہ علامت بھی ایسی نہیں کہ جگہ جگہ ٹانگ دی جائے ۔شعر میں اس کا استعمال صرف ایسے موقع پر کرنا چاہیے جہاں بالکل ضروری ہو۔ مولانا امتیاز علی عرشؔی مرحوم کو اس کا احساس ہوا تھا کہ دیوانِ غالبؔ (نسخۂ عرشؔی) میں انھوں نے اس سے حد سے زیادہ کام لیا تھا۔ چنانچہ دیباچے میں انھوں نے معذرت کی تھی جسے جناب رشید حسن خاں نے بھی درج کیا ہے:

> ”یوں تو اس نسخے میں وقف کی کئی علامتیں استعمال کی ہیں مگر ان میں سے کامے کو حد افراط تک برتا گیا ہے۔ چونکہ غالبؔ جیسے تعقید پسند استاد کے کلام کا مطلب سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر تھا اس لیے امید ہے کہ دیدہ ور نقاد اس سے درگزر فرمائیں گے“[1]

---

[1] دیوانِ غالبؔ (نسخۂ عرشؔی)، دیباچہ، ص ۱۱۹، اردو املا، ص ۵۴۶۔ رشید حسن خاں نے مقدمہ لکھا ہے، دراصل دیباچہ ہے۔

کتابوں کے ناموں یا دوسرے ناموں پر خط کھینچنا غیر ضروری ہے۔

الفاظ کے نیچے یا اوپر خط محض زور دینے کے لیے کھینچا جاتا ہے۔

علامات میں تخلص کے اوپر بَت یعنی تخلص کا نشان (ــــ) لگانے کا عام رواج ہے لیکن اب بڑی لکیر بھی کھینچ دی جاتی ہے اور زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔

کذا (کذا فی الاصل) کی جگہ قوسین میں سوالیہ نشان (؟) اور الخ (الیٰ آخرہ) کی جگہ چند الفاظ کے بعد تین نقطے بہتر ہوں گے۔ رک (رجوع کنید) اب بالکل ترک کرنے کے لائق ہے۔ اس کی جگہ ''دیکھیے'' لکھنا چاہیے۔

رموز اوقاف' علامات' اعراب اور اس طرح کی دوسری پابندیاں بڑھانے کے بارے میں برج موہن دتاتریہ کیفی نے بڑی پتے کی بات کہی تھی:

> ''چھاپے کے لیے آپ جتنے اعراب چاہیں وضع کرلیں' غریب کاتب یا کمپوز کرنے والے کو مجبور ہونا ہی پڑے گا لیکن عام طور پر لکھنے کا بھی لحاظ لازم ہے۔''[1]

---

[1] کیفیہ' ص ۳۴۸

خاتمہ

املا کی اصلاح کا تعلق مروّجہ املا سے ہے۔ اس سے بحث کرنے میں قدیم اور متروک املا کی مثالوں اور املا یا کتابت کی کھلی ہوئی غلطیوں کو اردو املا کی مذمت کے لیے منتخب نہ کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ایک ضروری بات یہ ہے کہ املا کی اصلاح کے اصول خودساختہ یا معدودے چند لوگوں کی رائے پر منحصر نہ ہوں۔ یہ طریقہ مناسب نہیں کہ کوئی ایک صاحب یا چند اصحاب املا کا ایک دستور بنا دیں اور یہ فرض کر لیا جائے کہ دوسرے لوگ چاروناچار اس کو قبول کر لیں گے۔ املا کی اصول سازی اور معیار بندی کا سب سے زیادہ تعلق موجودہ رواج اور آئندہ قبولِ عام سے ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وسیع پیمانے پر لوگوں سے صلاح و مشورہ کیا جائے اور اصلاح کے عملی نمونوں کی مقبولیت یا عدم مقبولیت کو معروضی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔

املا کی اصلاح میں کسی ذاتی رجحان پر بہت اعتماد یا اصرار نہ کرنا چاہیے۔ اصلاحیں تجویز کرنے اور ان پر عمل کرنے کا ہر شخص کو اختیار ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ اس پر مروّجہ املا کے نظم و ضبط کو قبول کرنے کی ذمّے داری

بھی عائد ہوتی ہے۔ اگر ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے گا تو اس سے انتشار دور ہونے کے بجائے اور بڑھے گا۔ املا کی اصلاح کے لیے ایسے اصولوں کی جستجو کرنا چاہیے جو تمام پہلوؤں پر حاوی ہوں یعنی صرف ایک لفظ یا چند الفاظ کو نہ دیکھا جائے بلکہ اس کے مشتقات اور اطلاق کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھی جائے۔ اگر کہیں اصول ساتھ نہیں دیتا تو مروجہ طریقے میں ترمیم بے سود ہو جائے گی۔

املا کی اصلاح میں تحقیقِ لغت، قواعد، لسانیات اور صوتیات سے حسبِ موقع مدد لی جاسکتی ہے لیکن چلن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اصلاح کے مواقع زیادہ تر وہیں مل سکتے ہیں جہاں املا سیال حالت میں ہو۔ الفاظ کے مسلمہ املا میں اصلاح مشکل ہی سے ہوسکتی ہے۔ تحقیق لغت سے آج ہم ایک نئے نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں، کل کوئی دوسری تحقیق اس کو رد کرسکتی ہے۔ روز روز املا نہیں بدلے گا، تحقیق بدلتی رہے گی۔ کسی زبان کا ایک ایک لفظ قواعد کے مطابق نہیں ہوسکتا، لسانیات اور صوتیات کے مطابق ہونے کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ یہ ایک مانا ہوا اصول ہے کہ زبان سے قواعد بنتی ہے، نہ کہ قواعد سے زبان۔ پوری زبان کو قواعد کے شکنجوں میں کسنا ناممکن ہے۔ لسانیات اور صوتیات کے علوم بھی زیادہ تر اس لیے ہیں کہ کسی زبان کی نوعیت اور اس کی لسانیاتی اور صوتیاتی خصوصیات وغیرہ کا مطالعہ کر لیا جائے، نہ اس لیے کہ لسانیات اور صوتیات کے قاعدوں کے مطابق اس کی اصلاح پر کمر باندھی جائے۔ یہ علوم یورپ اور انگلستان کی پیداوار ہیں اور وہیں سے کچھ

روشنی چھن چھنا کر اردو تک پہنچی ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان علوم کے فروغ کی وجہ سے یورپ کی کسی زبان نے کوئی قابلِ ذکر اصلاح قبول کی ہے۔ انگریزی اپنی تمام بے قاعدگیوں اور مشکلوں کے باوجود لسانیاتی اور صوتیاتی اعتبار سے کوئی ترمیم قبول نہیں کرتی لیکن وہ ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی تعلیم کے نئے نئے طریقے ان علوم کی مدد سے نکالے گئے ہیں لیکن ایک زمانے سے املا میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ انگریزی کی پہلی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ الفاظ آپ کو اسی طرح ملیں گے جس طرح پہلے کبھی تھے۔ ایک ہی حرف ایک لفظ میں ایک آواز دیتا ہے اور دوسرے لفظ میں دوسری۔ دو حرف مل کر بھی ایک جگہ ایک طرح تلفظ میں آتے ہیں، دوسری جگہ دوسری طرح۔ کتنے الفاظ ہیں کہ املا میں حرف شامل تو ہوتا ہے لیکن کوئی آواز نہیں دیتا۔ تلفظ کے لیے کتاب میں کوئی اشارہ نہ ملے گا۔ زبان جیسی کچھ ہوتی ہے ویسی ہی سیکھی اور سکھائی جاتی ہے۔ اصلاح کر کے نہیں سیکھی اور سکھائی جاتی۔ مان لیجیے کہ زبانیں اس طرح نہیں بدلتیں۔ اسے قدامت پرستی، تنگ نظری اور لسانی عصبیت وغیرہ نہ قرار دیجیے۔

اردو ماضی میں عربی و فارسی کے قواعد پرستوں کو بھگت چکی ہے اور اس کی انفرادیت اور مزاج سے توقع کی جا سکتی ہے کہ زمانہ حال کے ماہرینِ لسانیات کو بھی بھگت لے گی، حالانکہ اس حلقے سے اکثر اس پر ایسی کاری ضربیں لگائی جاتی ہیں کہ اس کے مستقبل کی طرف سے بعض اوقات مایوسی ہونے لگتی ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

''اردو کے تمام مصوتے بند آریائی ہیں اور تعداد و نوعیت کے اعتبار سے
فارسی اور عربی مصوتوں سے کافی مختلف۔ ان کے اظہار کے لیے جب
عربی فارسی رسمِ خط کو استعمال کیا گیا تو کئی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔''[1]

میرے خیال میں یہ دقت ہر رسمِ خط میں ہے اور اسی کو حل کرنے کے لیے بین الاقوامی صوتیاتی رسم خط بنایا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ماہرین لسانیات نے اب تک اردو کا صوتیاتی رسم خط بنانے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ وہ اردو لسانیات تو پڑھاتے ہیں اور اس پر خامہ فرسائی بھی کرتے ہیں لیکن خود اپنی زبان کی صوتیات کو دیوناگری اور بین الاقوامی صوتیاتی رسم خط کے سہارے کے بغیر بیان نہیں کر سکتے۔

اسی مضمون میں موصوف نے لکھا ہے:

''مصموں کے سلسلے میں ان زائد حروف کا ذکر بھی ضروری ہے جو عربی
سے لیے گئے ہیں اور جو ہمارے حروف تہجی اور نظام درس کے لیے
پیرتسمہ پا بنے ہوئے ہیں۔ میری مراد

ذ، ض، ظ، ط، ث، ص، ح وغیرہ سے ہے۔

صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مردہ لاشیں ہیں جسے اردو رسم خط اٹھائے

---

[1] اردو صوتیات کا خاکہ، مشمولہ اردوئے معلیٰ مرتبہ خواجہ احمد فاروقی، جلد سوم شمارہ ۴-۵، ص ۱۱۱

> ہوئے ہے، صرف اس لیے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے۔"[1]

میں بڑے احترام سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حقائق کو بیان کرنے کا یہ کوئی علمی پیرایہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین صاحب نے بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے لیکن یہ انداز اختیار نہیں کیا:

> "اردو رسم خط میں عربی کی مخصوص آوازیں ث، ص، ح، ذ، ض، ظ، ط، ع شامل ہیں۔ اردو میں ان کا وجود محض رسم الخط کی حد تک ہے۔ صوتی اعتبار سے یہ دوسرے حروف کی دوہری آوازیں ہیں۔"[2]

لیکن جانبداری ہوگی اگر یہ نہ کہا جائے کہ دوسرے موقعوں پر ڈاکٹر گیان چند جین صاحب نے بھی اردو رسم خط کی بعض خصوصیات کو اعجوبوں اور بوالعجبیوں سے تعبیر کیا ہے اور ایسے پیرائے اختیار کیے ہیں جن سے اردو رسم خط کی نفی ہوتی ہے۔[3] اسی طرح وہ ان اعتراضات سے بھی بہت متاثر ہیں جو ہندی کی طرف سے اردو پر کیے جاتے ہیں مثلاً:

> "ہندوستان میں اردو کو ہندی الفاظ سے روز افزوں اخذ واستفادہ کرنا ہے تاکہ دوسری ہندوستانی زبانوں کی اردو سے بھڑک کم ہو سکے۔

---

[1] اردو صوتیات کا خاکہ، مشمولہ اردوئے معلّیٰ، جلد سوم شمارہ ۴۔۵، ص ۱۱۶ [2] اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ از ڈاکٹر گیان چند جین، مشمولہ اردوئے معلّیٰ، جلد سوم شمارہ ۴۔۵، ص ۱۶۲ [3] دیکھیے حقائق از ڈاکٹر گیان چند ۱۹۷۸ء، مضمون یائے اضافت اور ہمزہ، ص ۳۸۲، ۳۸۳ اور ذکر و فکر از ڈاکٹر گیان چند ۱۹۸۰ء، مضمون اردو رسم الخط، ص ۳۴۸، ۳۴۹

اردو کو اگر ان ہندوستانی زبانوں کا ہم صفیر و ہم زبان رہنا ہے تو
ہندی کی ... آوازوں کو مسخ کرنے کی روش ترک کرنی چاہیے۔''[۱]

''اردو سے غیر اردو والوں کی بھڑک دور کرنے کے لیے یہ ضروری
ہو گیا ہے کہ اردو کے غیر ملکی عناصر کو کم کیا جائے۔''[۲]

اردو کے رسم خط اور اس کے الفاظ کے خزانے پر کیسے کیسے الزامات اور اعتراضات ہیں؟ اردو ان کا کہاں تک مقابلہ کرے گی اور کیا کیا تبدیلیاں لائے گی؟ پھر اگر یہ سب ہو بھی جائے تو ہندی اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی 'بھڑک' کیونکر دور ہو گی؟ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے اردو کے عربی نژاد حروفِ تہجی کو صوتیاتی نقطۂ نظر سے ''مردہ لاشیں'' اور ''وبالِ جان'' کہا ہے۔ دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھیے تو بقیہ حروفِ تہجی زندہ لاشیں قرار پائیں گے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گا کہ مردہ لاشیں زیادہ وبالِ جان ہوتی ہیں یا زندہ لاشیں۔ کم از کم ہمارے بعض ماہرینِ لسانیات نے اردو رسمِ خط کو ادھ مرا تو کر ہی دیا ہے۔

عربی، فارسی اور ہندی کے خلاف چند افراد نے لسانی عصبیت برتی ہو گی اور اب بھی برت سکتے ہیں لیکن یہ رویّہ اردو کے مجموعی مزاج کے منافی ہے اور اردو املا یا زبان کی اصلاح میں اس سے بالکل سروکار نہیں رکھا جا سکتا ہے اردو جو مختلف زبانوں کی رہینِ منت ہے کسی قسم کی لسانی عصبیت کا شکار ہو کر زندہ نہیں رہ

---

[۱] [۲] اردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ از ڈاکٹر گیان چند جین ، مشمولہ اردوئے معلیٰ ، جلد سوم شمارہ ۴۔۵
ص ۱۵۵، ۱۷۵

سکتی۔ علمی و ادبی زبان کے سلسلے میں اس نکتے کو سمجھنا چاہیے کہ مسئلہ صرف انھیں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب اور روایات کا ہے جو اردو میں کبھی آ گئی تھیں ورنہ جدید عربی اور جدید فارسی سے اردو کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

اردو املا صوتیاتی اعتبار سے ناقص ہے تو اردو کا صوتیاتی رسمِ خط بنایئے اور لغت اور دوسری ضروریات میں اس سے کام لیجیے۔ اردو املا کو صوتیاتی رسمِ خط کے سانچے میں ڈھالنے سے مسئلہ حل نہ ہوگا اور نئی دشواریاں پیدا ہوں گی۔ یہاں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا یہ قول توجہ کا محتاج ہے :

''لوگ اکثر املا کو بھی زبان سمجھ بیٹھتے ہیں، حالانکہ املا تو لفظوں کی تصویر کھینچنے کی ایک کوشش ہے جو ہمیشہ کامیاب نہیں رہتی۔ املا کے قاعدے کیسے ہی ہمہ گیر اور مکمل بنائے جائیں زبان کی پوری اور سچی ترجمانی ان سے مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔ ایک 'کوئی' کا لفظ ہم کئی طرح ادا کرتے ہیں۔''[1]

☆☆

---

[1] کلیاتِ ولی، مقدمہ، بحوالہ 'اردو املا' ص ۵۲۴

مصنف کی دوسری کتابیں:

☆اردو میں قصیدہ نگاری۔۱۹۵۸ء؛ ۱۹۶۷ء؛ ۱۹۷۲ء؛ ۱۹۷۹ء؛ ۱۹۸۹ء؛ ۲۰۰۰ء

☆تنقید و تجزیہ (مضامین) ۱۹۶۱ء

☆مطالعۂ امیر (تحقیقی مقالہ) ۱۹۶۵ء

☆انتخابِ قصائد اردو۔۱۹۶۹ء؛ ۱۹۷۵ء؛ ۱۹۸۹ء؛ ۱۹۹۵ء

☆غالبیات کے چند مباحث ۱۹۷۳ء

☆برگِ غزل (مجموعۂ کلام) ۱۹۸۱ء

☆زبان و لغت ۱۹۸۳ء

☆غالبیات اور ہم ۱۹۹۴ء

☆اردو رسم الخط اور املا ایک محاکمہ ۱۹۹۹ء

☆ہندی رہندوی پر ایک نظر اور دوسرے مضامین ۱۹۹۹ء

☆ادبی تحقیق و تنقید (مضامین) ۲۰۰۲ء

☆برگِ سحر (مجموعۂ کلام) ۲۰۰۲ء

اردو حروفِ تہجّی

ا ب پ ت ٹ ث

ج چ ح خ

د ڈ ذ ر ڑ ز ژ

س ش ص ض ط ظ

ع غ ف ق ک گ

ل م ن و

ہ ھ ء ی ے

دیکھیے اردو رسم الخط اور املا ایک محاکمہ از ڈاکٹر ابو محمد سحر ص ۴۲

ڈاکٹر ابو محمد سحرؔ کی دوسری مطبوعہ کتابیں

اردو میں قصیدہ نگاری

انتخابِ قصائد اردو

مطالعۂ امیرؔ

تنقید و تجزیہ

برگِ غزل

غالبیات کے چند مباحث

غالبیات اور ہم

زبان و لغت

اردو رسم الخط اور املا، ایک محاکمہ

ہندی / ہندوی پر ایک نظر اور دوسرے مضامین

ادبی تحقیق و تنقید

برگِ سحر

اردو املا اور اس کی اصلاح از ڈاکٹر ابو محمد سحر ☆ مکتبۂ ادب، ۳۹ رمالویہ نگر، بھوپال۔۳